قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جون 1967

سچّے موتی

رسول اللہؐ نے فرمایا۔

اِنَّ اللّٰہَ فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَیِّعُوْھَا۔ وَحَرَّمَ حُرُمَاتٍ فَلَا تَنْتَھِکُوْھَا۔ وَحَدَّ حُدُوْدًا فَلَا تَعْتَدُوْھَا۔ وَسَکَتَ عَنْ اَشْیَاءَ مِنْ غَیْرِ نِسْیَانٍ فَلَا تَبْحَثُوْا عَنْھَا۔

اللہ نے تم پر کچھ فرائض عائد کئے ہیں انہیں ضائع نہ کرو۔ کچھ چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان کے پاس نہ پھٹکو۔ کچھ حدود مقرر کی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور کچھ چیزوں کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے اور اس نے ابتداءً سے کیا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ انہیں بیان کرنا بھول گیا ہے ان چیزوں کے متعلق خواہ مخواہ کرید نہ کرو۔

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

[illegible]

قرآن کریم کو براہ راست [illegible] اسلام کی [illegible] سے آگاہ ہونے کے لئے حسب ذیل کتب [illegible] ضروری ہیں

[illegible]

قرآن کریم کے تمام الفاظ کے معانی ان کے مادوں کے اعتبار سے متعین کئے گئے ہیں اور قرآنی آیات سے بتایا گیا ہے کہ قرآن نے انہیں کس طرح استعمال کیا ہے اور [illegible] اسلام کی تعلیم کے بنیادی تصورات کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ بڑی مستند اور معلومات افزا کتاب ہے۔ اس کے گہرے مطالعہ سے قرآن کریم خود بخود سمجھ میں آ جاتا ہے۔ کتاب اعلیٰ درجہ کے سفید کاغذ پر ٹائپ میں چھپی ہے اور مجلد ہے۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے فی جلد اور چوتھی جلد کی قیمت بارہ روپے ہے۔ پورا سیٹ پچاس روپے میں مل سکتا ہے۔

سلیم کے نام خطوط :

تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق جس قدر سوالات پیدا ہوتے ہیں ان کا نہایت صاف، واضح اور مدلل جواب خطوط کی شکل میں۔ اس کتاب نے ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ میں صحیح قرآنی انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ عمدہ سفید کاغذ۔ ٹائپ کی نفیس چھپائی۔ مجلد۔ قیمت جلد اول آٹھ روپے۔ جلد دوم و سوم [illegible] روپے۔

انسان نے کیا سوچا :

گذشتہ اڑھائی ہزار برس میں دنیا کے ممتاز ترین مفکرین، مؤرخین، سیاستدانوں اور سائنس دانوں نے زندگی کے بنیادی مسائل کو خالص عقل کی رو سے حل کرنے کی کوششیں کی ہیں ان کا نہایت دلکش بیان اور اس حقیقت کی وضاحت کہ کیا تنہا انسانی زندگی کے مسائل کو حل کر سکتی ہے یا اسے وحی کی راہ نمائی کی ضرورت ہے۔ بڑی تقطیع، سفید کاغذ، اعلیٰ درجہ کی ٹائپ کی چھپائی۔ قیمت مجلد بارہ روپے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام، [illegible] کراچی

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

ٹیلی فون نمبر

۸۰۸۰۰

خط و کتابت

ناظم ادارہ

طلوعِ اسلام

۲۵/بی ۔ گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ

پاکستان — ایک روپیہ

ہندوستان — ڈیڑھ روپیہ

بدلِ اشتراک

پاکستان — سالانہ — دس روپے

ہندوستان — سالانہ — پندرہ روپے

غیر ممالک — سالانہ — ایک پونڈ

جلد نمبر ۲۰ ❁ جون ۱۹۶۷ء ❁ نمبر ۶

فہرست مضامین

۱۔ لمعات		۲
۲۔ سی۔ آئی۔ اے اور پاکستان		۲۲
۳۔ افریقہ، ایشیا کا عالمی کردار۔	(محترم خورشید عالم صاحب)	۲۵
۴۔ اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری۔	(محترم پرویز صاحب)	۳۳
۵۔ پیشۂ وکالت کی شرعی حیثیت	(سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب)	۵۷
۶۔ حقائق و عبر۔	(مذہبی پیشوائیت کی برکات) (اسلام پرستی کے نتائج) (کتاب و سنت کے عین مطابق) (ماٰلین اقبال) (زندہ جلو)	۶۱
۷۔ باب المراسلات	(چند فریب اور ان کی حقیقت) (جمہوریت)	۶۷
۸۔ ایک قدیم مسیحی فرقہ کے عقائد		۷۳
۹۔ رابطۂ باہمی		۷۷
۱۰ نقد و نظر		۷۹-۸۰

ایڈیٹر۔ محمد خلیل۔ ناشر۔ سراج الحق۔ مقام اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲۔ لاہور۔ پرنٹر۔ شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ۔ اشرف پریس، ایبک روڈ، لاہور۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

مذہبی پیشوائیت (پریسٹ ہڈ) سے کیا مراد ہے؟

آج کل اکثر مجالس میں، اس قسم کی باتیں آپ کے سننے میں آتی ہوں گی۔

"اجی صاحب! طلوع اسلام کو تو ملّا کے نام سے چڑ ہو گئی ہے۔ اس کے نزدیک پاکستان میں لے دیکے، قابلِ توجہ مسئلہ ہی ایک ہے۔ اور وہ ہے ملا ازم۔ 'ملّا' اسلام کا سب سے بڑا دشمن اور پاکستان کے لئے مہیب ترین خطرہ ہے۔ وہ ملّا بیچارے کے پیچھے لٹھ لئے پھر رہا ہے اس کی مخالفت اس کے نزدیک جہادِ عظیم ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے علماء میں سیاہ بھیڑیں بھی ہیں۔ ان میں جاہل بھی ہیں، پست کردار بھی ہیں، مفاد پرست بھی ہیں۔ لیکن ہمارے معاشرہ میں کون سا گروہ ہے جس میں اس قسم کے لوگ نہیں پائے جاتے۔ تو اس کے یہ معنی تھوڑے ہیں کہ آپ سب کے سب علماء کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا شروع کر دیں۔ آپ علماء سوء کی مذمت کیجئے۔ لیکن ان میں جو علماء حق ہیں ان کی مخالفت کے کیا معنی؟ اسلام کے لئے ان حضرات کی خدمات بڑی قابلِ قدر ہیں۔ اس تیرہ سو برس میں اگر اسلام قائم رہا ہے تو انہی کے دم قدم سے۔ اور اگر آج بھی ہم خدا اور رسول کا نام سن رہے ہیں۔ تو انہی کی وجہ سے۔ یہ نہ رہیں تو کوئی شریعت کے نام تک سے واقفیت نہ ہو۔ آپ کی مسجدیں ویران ہو جائیں۔ اذانیں خاموش ہو جائیں۔ قرآن گنگ ہو کر رہ جاتے۔ آپ کے مُردے خراب ہو جائیں، کوئی جنازہ تک پڑھانے والا نہ ہو۔ یہ بیچارے ساری عمر تحصیل علم میں صرف کر دیتے ہیں۔ اور

خدا کی خاطر .... "

گھنٹوں اس قسم کی تقریریں اور گفتگوئیں جاری رہیں گی۔ اور اس کے بعد سمجھ لیا جائے گا کہ ہم نے دین کے ان محافظوں کی مدافعت، اور طلوعِ اسلام کی مذمت کرکے، اسلام کی بہت بڑی خدمت کی ہے ــــ اور ان ساری لمبی چوڑی تقریروں کا ماحصل یہ ہے کہ ان مقررین کو نہ اس کا علم ہے کہ ملّا ازم (PRIEST - CRAFT) کہتے کسے ہیں اور نہ یہ معلوم کہ طلوعِ اسلام مخالفت کس بات کی کرتا ہے۔ طلوعِ اسلام قوم کے سامنے جو سوال (یا پرابلم) پیش کرتا ہے، اس کا تعلق نہ علماءِ سوء سے ہے نہ علماءِ حق سے ــ نہ نیک کردار ملاؤں سے نہ بدکردار سیاہ بھیڑوں سے ــ نہ بُرے واعظوں کی جہالت سے، نہ اچھے خطیبوں کی حق گوئی سے ــ اس کا افراد سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ اس کے نزدیک جس طرح اسلام ایک نظریۂ زندگی، ایک تصورِ حیات، ایک زاویۂ نگاہ، ایک طرزِ فکر، ایک نہجِ عمل، ایک منتہائے نگاہ، ایک منزلِ مقصود، بلکہ ایک ضابطۂ زندگی، ایک دستورِ اساسی، ایک نظامِ حیات کا نام ہے، اسی طرح مذہبی پیشوائیت، (مُلّا ازم) یا پریسٹ ہُڈ بھی ایک اندازِ فکر، ایک زاویۂ نگاہ، ایک رجحانِ قلب (ATTITUDE OF MIND) کا نام ہے۔ اور یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد (ANTI - THESIS) ہیں۔ اسلام، مُلّا ازم کی انسٹی ٹیوشن (INSTITUTION) کو ختم کرنے کے لئے آیا تھا۔ اور ملّا ازم اسلام سے اپنا انتقام لینے کے لئے وجود میں آئی تھی۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے ازلی دشمن ہیں اور ایک جگہ نہیں رہ سکتے۔ جہاں اسلام ہوگا وہاں ملّا ازم نہیں ہوگی، جہاں مُلّا ازم ہوگی، وہاں اسلام نہیں ہوگا۔ لہٰذا یہاں سوال اچھے یا بُرے افراد کا نہیں، اس خلافِ اسلام نظریۂ زندگی کا ہے جس کا حامل مُلّا ہے۔ اسے زیادہ وضاحت سے یوں سمجھئے کہ (مثلاً) اگر آپ، دہریت (ATHEISM) کی مخالفت کریں، اور فریقِ مخالف آپ سے کہے کہ "صاحب! آپ دہریوں کی مخالفت کیوں کرتے ہیں، ان میں آپ کو بڑے بڑے بلند کیریکٹر کے لوگ ملیں گے۔ تاریخِ عالم کو اٹھا کر دیکھئے۔ کتنے بڑے بڑے مفکر، سائنس دان دہریئے تھے۔ پھر آپ ان میں ایسے لوگوں کو بھی دیکھیں گے جو نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں کرتے ہیں۔ جو دوسروں کی خاطر اپنی جان جوکھوں میں ڈال دیتے ہیں۔ اور ...." اس سے آپ کو بھی اتفاق ہوگا۔ لیکن اس سے دہریت تو حق بجانب، یا اسلام کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہو جائے گی۔

یہ مثال شاید آپ کو مفرط (EXTREME) سی نظر آئے گی۔ لیکن یہ قطعاً مفرط نہیں (جیسا کہ آپ ابھی دیکھیں گے) پریسٹ ہڈ (مذہبی پیشوائیت) کی انسٹی ٹیوشن اسی طرح اسلام کی نقیض ہے جس طرح

دہریت، اسلام کی ضد ہے۔ یہ نکتہ بڑی گہری توجہ کا محتاج ہے۔ اور اس قابل کہ اس پر نہایت ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے۔ اس لئے کہ جس چیز کو ہم صدیوں سے عین اسلام سمجھتے چلے آ رہے ہوں، اور وہ عقیدہ ہمارے شعور سے نیچے اُتر کر، تحت الشعور کی گہرائیوں تک میں جاگزیں ہو چکا ہو اس کے خلاف کچھ سننے کے لئے بڑے صبر و تحمل کی ضرورت اور اُسے باطل تصور کرنے کے لئے بڑی جرأت و عزیمت درکار ہو گی اب توجہ سے سنیئے کہ اصل معاملہ کیا ہے۔

نبی اکرمؐ (انبیائے سابقہ کی طرح) خدا کی طرف سے ایک ضابطۂ حیات لائے۔ اور اس کے مطابق آپؐ نے ایک معاشرہ متشکل فرمایا، اسے اسلام کہتے ہیں ۔۔۔ یہ ایک ایسا نظریۂ زندگی اور نظامِ حیات تھا جو کفار اور مشرکین عرب کے نظریۂ زندگی اور نظامِ حیات کے بھی خلاف تھا۔ اور اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کی مذہبی پیشوائیت کے پیش کردہ نظریہ و نظامِ زندگی کے بھی خلاف ۔۔۔ چنانچہ ان دونوں گروہوں کی طرف سے اس کی مخالفت ہوئی اور سخت مخالفت ۔۔۔ کفارِ عرب کا اعتراض یہ تھا کہ ان کے دنیاوی معاملات کو "مذہب" کے تابع رکھنے کی دعوت کیوں دی جاتی ہے۔ اور اہلِ کتاب کی مذہبی پیشوائیت اسے برداشت نہیں کرتی تھی کہ "مذہب" میں دنیاوی امور کو دخیل کار سمجھا جائے۔ اسلام ان دونوں نظریات کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔ اس کا پیغام یہ تھا کہ انسانی زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے جسے "مذہب" اور "دنیاوی امور" ۔۔۔ دین اور دنیا، یا دنیا اور آخرت ۔۔۔ میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام کا نظام، انسان کی پوری زندگی کو محیط ہے۔ اس میں اس ثنویت (DUALITY) کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ تفریق حقیقت (REALITY) کے خلاف اور صداقت (TRUTH) کی نقیض ہے۔ اس کی رُو سے دُنیا (THIS-WORDLINESS) اور آخرت (OTHER-WROLDLINESS) میں مغائرت کا تصور، دین کی مسخ شدہ صورت، یعنی "مذہب" (RELIGION) کا پیدا کردہ ہے۔ دین اس مغائرت کو مٹانے کے لئے آتا ہے۔

اس لئے دین، اور مذہبی پیشوائیت کی طرف سے پیش کردہ "مذہب" ایک دوسرے کی ضد ہیں ۔۔۔ نبی اکرمؐ کے ظہورِ قدسی کے وقت، دنیا میں دین کہیں نہیں تھا۔ اُس وقت ہر جگہ مذہب کا دور دورہ تھا۔ اور یہی تھا وہ "مذہب" جس کے خلاف اسلام ایک کھلا ہوا الٹی میٹم بن کر آیا تھا ۔۔۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ۔۔۔

کلیسا کی بُنیاد رہبانیت تھی
سماتی کہاں اس فقیری میں میری

خصومت تھی سلطانی و راہبی میں
کہ وہ سربلندی ہے یہ سر بزیری
دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی
دوئی چشمِ تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرانشیں کا
بشیری ہے آئینہ دار نذیری!

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف، منکرینِ عرب اور اہل کتاب (یعنے دنیا داروں اور مذہب پرستوں) نے جو متحدہ محاذ قائم کیا تھا، وہ اسی "دوئی" کو قائم رکھنے اور وحدت پر مبنی نظریۂ زندگی کو غالب نہ آنے دینے، کی جنگ تھی۔ کچھ عرصہ کی کشمکش کے بعد، انہوں نے چاہا کہ اس نئے نظریہ حیات (اسلام) کے ساتھ کسی قسم کی مفاہمت ہو جائے۔ لیکن آگ اور پانی میں مفاہمت (COMPROMISE) کی گنجائش کہاں ہوتی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اپنے رسولؐ سے برملا کہہ دیا کہ — وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ۔ (۶۸/۹) — یہ چاہتے ہیں کہ تو ان سے مفاہمت کرے۔ سو دیکھنا — لَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ۔ (۱۱/۱۱۳) — ان لوگوں کی طرف ذرا سا بھی نہ جھکنا ورنہ تم بھی تباہ ہو جاؤ گے۔ چنانچہ یہ جنگ اسی طرح جاری رہی، تا آنکہ ثنویت کا نظریۂ زندگی ختم ہو گیا۔ اور اس کی جگہ دین نے لے لی۔ اس میں جس طرح خالص دنیا دارانہ نظریہ (ملوکیت کا تصور) باقی نہیں تھا، اسی طرح مذہبی پیشوائیت (پریسٹ ہڈ) کا بھی خاتمہ ہو گیا تھا — ایک نظامِ حیات تھا جس میں، مملکت کے زیر اہتمام، تمام معاملاتِ زندگی، خدا کی عطا کردہ راہ نمائی کی روشنی میں طے پاتے تھے۔ جس میں (اقبال کے الفاظ میں) ؎

از کلیدِ دیں، درِ دنیا کشاد

"دنیا کا ہر تالا دین کی چابی سے کھولا جاتا تھا"۔ یوں دنیا سے ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ ہو گیا — اس کا نام اِسلام تھا۔

یہ نظامِ وحدت (یعنے دین) کچھ عرصہ تک قائم رہا۔ اس کے بعد مسلمانوں میں انفرادی مفاد پرستی نے پھر سے سر ابھارا۔ اور اُن میں ملوکیت قائم ہو گئی — ملوکیت کے یہ معنی نہیں کہ باپ کے بعد بیٹا وارثِ تخت و تاج ہو جائے — ملوکیت کے معنی ہیں وہ نظامِ زندگی جس کی بنیاد اس

ثنویت پر ہو جسے اسلام نے مٹایا تھا۔ لہٰذا جب ملوکیت آئی، تو اس کے ساتھ ہی مذہبی پیشوائیت بھی آگئی ــــ "ثنویت کے تو معنی ہیں" دو ٹکڑوں میں بٹ جانا" ــــ لہٰذا تنہا ملوکیت یا مذہبی پیشوائیت، ثنویت (DUALITY) بن نہیں سکتی۔ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت، لازم و ملزوم ہیں ــــ لیکن ہماری غلط نگہی ملاحظہ ہو کہ ہم ملوکیت کو تو خلافِ اسلام قرار دیتے ہیں۔ اور اس کے خلاف منبر اور اسٹیج دونوں سے آوازیں بلند ہوتی ہیں، لیکن اس کے دوسرے جزوِ لاینفک (INDISPENSABLE PART)، مذہبی پیشوائیت کو نہ صرف یہ کہ خلافِ اسلام نہیں سمجھتے بلکہ اسے عینِ اسلام، اور مذہبی پیشواؤں کو محافظِ دین سمجھتے ہیں۔ یعنی ہم نے کچھ اس طرح تصور کر رکھا ہے کہ مسلمانوں میں ملوکیت کہیں باہر سے آموجود ہوئی، اور اسلام اپنی خالص شکل میں، الگ کا الگ رہا ــــ اس اسلام کے محافظ، مذہبی پیشوا ہیں ــــ یہ تصور بنیادی طور پر غلط ہے ــــ ہم میں ملوکیت، کہیں خارج سے نہیں آئی تھی۔ اسلام اگر اپنی شکل میں موجود ہو تو ملوکیت آ ہی نہیں سکتی ــــ ہم نے اپنے دین (نظامِ حیات) کو پھر سے دو حصوں میں تقسیم کر لیا تھا۔ ان میں سے ایک حصہ ملوکیت تھا اور دوسرا حصہ مذہبی پیشوائیت۔

اس تقسیم کے سلسلہ میں، ایک بنیادی نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ (مثال کے طور پر) ہم دو سیر میدہ میں پاؤ بھر چینی ملاتے ہیں۔ اس کے بعد اس مرکب کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں حصوں میں سے، ہر ایک حصہ میں، ایک سیر میدہ اور آدھ پاؤ چینی آجائے گی۔ جب اسلام، ملوکیت اور پیشوائیت میں تقسیم ہوتا ہے تو اس کی شکل یہ نہیں ہوتی کہ کچھ اسلام ملوکیت میں آجاتا ہے اور کچھ مذہبی پیشوائیت میں ــــ یا سارا اسلام مذہبی پیشوائیت میں آجاتا ہے، اور ملوکیت اسلام کے بغیر رہ جاتی ہے ــــ یہ غلط ہے۔ اس تقسیم سے اسلام کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ وہ (یا اس کا کچھ حصہ) نہ ملوکیت میں رہتا ہے، نہ مذہبی پیشوائیت میں ــــ یہ دونوں اسلام سے عاری ہوتے ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھیے۔ جیسے ہائیڈروجن اور آکسیجن کے امتزاج سے پانی بن جاتا ہے۔ اب اگر پانی کا پھر سے تجزیہ کر دیا جائے تو یہ نہیں ہوتا کہ اس کا کچھ حصہ ہائیڈروجن میں چلا جاتا ہے اور کچھ حصہ آکسیجن میں ــــ اس تقسیم سے پانی کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ اور خالص ہائیڈروجن اور خالص آکسیجن باقی رہ جاتی ہے۔ ان دونوں کی بنیادی خصوصیات (PROPERTIES) نہ صرف یہ کہ پانی سے مختلف ہوتی ہیں، بلکہ پانی کی ضد ہوتی ہیں ــــ پانی آگ بجھاتا ہے، اس کے برعکس ہائیڈروجن خود جلتی ہے اور آکسیجن دوسری چیزوں کے جلنے میں مدد دیتی ہے۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ جب مسلمانوں میں ملوکیت (یعنی لادینی سیاست) آئی تو اسلام نہ ملوکیت میں باقی رہا، نہ مذہبیت میں ــــ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

ہوئی دین و دنیا میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری، ہوس کی فقیری!

اس ثنویت سے اسلام دنیا سے رخصت ہوگیا تھا۔ یعنی باقی اقوامِ عالم میں (جن میں ملوکیت، اور مذہبیت پہلے ہی الگ الگ تھیں) اسلام موجود ہی نہیں تھا۔ جب مسلمانوں نے بھی اپنے ہاں یہی نظامِ زندگی رائج کر لیا، تو اسلام ان کے ہاں سے بھی رخصت ہوگیا۔ یوں اسلام دنیا میں کہیں باقی نہ رہا۔

یہ صورتِ حال صرف مسلمانوں کے ہاں پیدا نہیں ہوئی، دنیا کی ہر قوم کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ (قرآن کریم کے بیان کے مطابق) دنیا کی ہر قوم میں حضرات انبیاء کرامؑ آتے۔ اور (ملوکیت و مذہبیت کو مٹا کر) دین کا نظام قائم کرتے۔ لیکن ان کے نام لیوا، کچھ عرصہ کے بعد، پھر سے وہی ثنویت قائم کر لیتے۔ اس طرح، دین، ان کے ہاں سے رخصت ہو جاتا اور اس کی جگہ "مذہب" لے لیتا۔ یہ جو ہم تاریخ عالم میں "مذہب اور سیاست" کی کشمکش کے قصے پڑھتے ہیں تو یہ حق و باطل کی کشمکش کے قصے نہیں یہ باطل ہی کے دو پیکروں کے باہمی تصادمات کی داستانیں ہیں۔ اس ثنویت کا نتیجہ یہ ہوتا کہ انسانوں کی دنیا کے ایک حصے (یا یوں کہئے کہ انسانی زندگی کے ایک گوشے) میں دنیاوی حکمرانوں کی حکومت ہوتی اور دوسرے حصے میں مذہبی پیشوائیت کا تسلط ــــ جب تک ان دونوں اقتداروں میں مصالحت رہتی، ان کی باہمی کشمکش کا سوال پیدا نہ ہوتا۔ جب کبھی ایسا ہوتا کہ ان میں سے ایک اقتدار اپنی حدود سے آگے بڑھ کر دوسرے کی مملکت میں دخل انداز ہوتا تو ان میں باہمی ٹکراؤ پیدا ہو جاتا۔ اس ٹکراؤ میں اربابِ سیاست کو (اگر کبھی غلبہ حاصل ہوتا بھی تو وہ) عارضی اور ہنگامی غلبہ ہوتا۔ جیت عام طور پر اہلِ مذہب کی ہوتی۔ اس لئے کہ عوام ان کے ساتھ ہوتے اور ان کی اپیل جذباتی ہوتی۔ اس بنا پر اربابِ سیاست کو ان سے بالعموم مصالحت کرنی پڑتی۔ یورپ میں "پوپ اور بادشاہ" (کلیسا اور سلاطین) کی جنگیں اسی کشمکش کی خون آلود داستانیں ہیں۔

ملوکیت کے قیام کے بعد یہی صورت مسلمانوں کی ہوئی۔ ان میں مذہبی پیشوائیت اور اربابِ حکومت کے دو متوازی اقتدار قائم ہو گئے۔ ان میں باہمی ٹکراؤ بھی ہوتا رہا۔ ہماری تاریخ میں، مذہبی پیشوائیت کی طرف سے جس چیز کو، اسلام کے خلاف سلاطین کا استبداد کہہ کر پیش کیا جاتا ہے ــــ وہ

درحقیقت مذہبی پیشوائیت کے اپنی حد سے بڑھتے ہوئے اقتدار کی روک تھام کے لئے سلطنت کی تدابیر تھیں۔ اور جس چیز کو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اسلام کی مدافعت میں جہاد سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہ مذہبی پیشوائیت کے اقتدار کو بحال رکھنے کی جدوجہد تھی۔ اس کشمکش میں نہ سلطنت، اسلام کے خلاف نبرد آزما تھی، نہ مذہبی پیشوائیت، اسلام کی مدافعت اور استحکام کے لئے صف آرا۔ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اس ثنویت میں اسلام کہیں موجود ہی نہیں تھا۔ جو آواز، ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت دونوں کے خلاف بلند ہوئی ہوگی اُسے اسلام کے احیاء کے لئے جہاد کہا جائے گا — لیکن ہماری تاریخ نے (جو یا تو سلطنت کی مرتب کرائی ہوئی ہے یا مذہبی پیشوائیت کی مدون کردہ) ان آوازوں کو اپنے ہاں بہت کم جگہ پانے دی ہے — اور اگر کہیں ان کا ذکر آیا بھی ہے تو انتہائی سب و شتم کے ساتھ۔

یہ سلسلہ صدیوں سے اسی طرح چلا آرہا تھا کہ علامہ اقبالؒ نے اس کا احساس کیا اور اس کے خلاف بھرپور آواز بلند کی۔ آپ اقبالؒ کی شاعری (اور ان کے خطبات) وغیرہ میں دیکھئے، ان کا مرکزی نقطہ "سلطانی و مُلائی" کے خلاف صف آرائی دکھائی دے گا۔ وہ مسلمانوں کی تباہی کا باعث ہی ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کو قرار دیتے ہیں جب کہتے ہیں کہ ؎

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری

اے کشتۂ سلطانی و مُلائی و پیری

وہ جب کہتے ہیں کہ — "درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری" — تو ان کا ہدف کوئی خاص سلطان اور خاص مُلّا یا پیر نہیں ہوتا۔ وہ ملوکیت اور مُلّائیت کی (INSTITUTIONS) کو عیاری قرار دیتے ہیں۔ جب پنڈت جواہر لال نہرو نے (تحریک قادیانیت کے سلسلہ میں) یہ کہا کہ کمال اتاترک نے قصرِ خلافت کو منہدم اور مُلّائیت کو ختم کر کے، اسلام کو خیرباد کہہ دیا ہے تو اس کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے لکھا کہ

ترکوں کا مادیت کی طرف آنا، مُلائی و پیری (MULLA-CRAFT AND SUFI-CRAFT) کے خلاف بڑا مؤثر حربہ ہے۔ یہ لوگ عوام کی سادہ لوحی اور جہالت سے فائدہ اٹھا کر، انہیں دانستہ اندھیرے میں رکھتے ہیں ۔۔۔۔۔ اتاترک نے انہیں دنیا سے مذہب سے خارج کر کے ایک ایسا

کارنامہ کیا ہے جس سے امام ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہؒ کی روح وجد میں آگئی ہو گی۔
مشکوٰۃ شریف کی ایک حدیث کی رُو سے، لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنے کا حق صرف
ان کے امیر یا اس کے مقرر کردہ عمّالِ حکومت کو حاصل ہے ۔۔ ۔۔۔۔۔۔ (باقی رہا
خلافت کا معاملہ سو) اسلام، ملوکیت کے سخت خلاف ہے۔ خلافت بنی امیہ
اور بنی عباس کے زمانے سے خالص ملوکیت بن چکی تھی۔ اور اتاترک نے اسے ختم کر کے
روحِ اسلام کے عین مطابق قدم اٹھایا ہے۔

(اقبال کی تقاریر و بیانات ۔ (انگریزی) ص ۱۳۴، ۱۳۵)

وہ اپنے خطبات میں، ملائیت اور ملوکیت کے خاتمہ کو، ختمِ نبوت کی برکات میں سے شمار کرتے ہیں، جس سے انسان کو (قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے) فکر و عمل کی کامل آزادی حاصل ہو گئی۔ (ص ۱۲۰) ۔ اسی سلسلہ میں وہ آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

> اسلام کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اسی بنا پر ہمیں دنیا کی آزاد ترین قوم ہونا چاہیئے۔ پہلے زمانے کے مسلمان جو ایشیا سے قبل از اسلام کی روحانی غلامی سے نئے نئے آزاد ہوتے تھے، اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ ختمِ نبوت کے اس بنیادی تخیل کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ کر سکتے۔ لیکن دورِ حاضر کے مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سمجھے (قرآن کے) غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرہ کی تشکیلِ جدید کرے۔ اور اس طرح وہ عالمگیر جمہوریت قائم کر کے دکھائے جو اسلام کی اصل و غایت ہے۔ لیکن جو ابھی پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی۔ (ص ۱۸۰)

علامہ اقبالؒ اسی شدومد سے ملوکیت اور پیشوائیت کی مخالفت کرتے رہے۔ مُلّا نے اس مخالفت کا کوئی خاص نوٹس نہ لیا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ یہ محض ایک شاعر کا تخیل، یا فلسفی کا خواب ہے، جسے چنداں اہمیت حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے بعد علامہ اقبالؒ نے احیاءِ اسلام کے سوال کے مثبت پہلو پر غور کیا۔ اور ان کی بصیرتِ قرآنی نے انہیں اس نتیجہ پر پہنچایا کہ ملوکیت و پیشوائیت کا خاتمہ اور صحیح دین کا قیام کسی ایسی مملکت میں ممکن نہیں جہاں پہلے سے مسلمانوں کی ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت قائم ہو۔ اس کی عملی شکل ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کیا جائے جس میں پہلے سے کوئی مملکت قائم نہ ہو۔ اور اس طرح وہاں صحیح اسلام کا نظام قائم کر دیا جائے جس میں ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت بار نہ پا

سکے۔ اس مقصد کے پیش نظر انہوں نے ۱۹۳۰ء میں پاکستان کا تصور پیش کیا۔ اب مُلّا نے اس خطرہ کو بھانپا۔ اور ایک متحدہ محاذ بنا کر نظریۂ پاکستان کی مخالفت کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ علماء کرامؒ کی طرف سے تحریک پاکستان کی مخالفت، درحقیقت اسی کشمکش کی صدائے بازگشت تھی جو چودہ سو سال پہلے، مدینہ میں، نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے خلاف اہل کتاب کی طرف سے برپا کی گئی تھی۔ پاکستان کے قیام میں مذہبی پیشوائیت کو اپنے اقتدار کی موت نظر آرہی تھی۔ وہ اسی ثنویت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے، جو صدیوں سے مسلسل چلی آرہی تھی۔ ان کا موقف یہ تھا کہ (انگریز کے چلے جانے کے بعد) ہندوستان میں جو نظام قائم ہوگا اس میں مسلمانوں کو عقائد، عبادات اور پرسنل لاز کی آزادی حاصل ہوگی۔ اور امور مملکت، سیکولر انداز سے طے پائیں گے۔ یہی ان کے نزدیک "اسلام" کا منشا تھا۔ علامہ اقبالؒ کی زندگی کے آخری ایام میں، مذہبی پیشوائیت کے سب سے بڑے ترجمان، (مولانا حسین احمد مدنی مرحوم) کے ساتھ جو معرکۂ "دین و وطن" برپا ہوا تھا، اس میں آپ دیکھئے، یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ ۱۹۳۸ء میں علامہ اقبالؒ کا انتقال ہو گیا تو مذہبی پیشوائیت نے اطمینان کا سانس لیا کہ اب خطرہ ٹل گیا ہے۔ لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ قائداعظم محمد علی جناحؒ اسی شمع کا علمبردار تھا جسے فکر اقبال نے روشن کیا تھا۔ انہوں نے بھی اس پکار کو برابر جاری رکھا کہ پاکستان میں نہ ملوکیت کو کسی قسم کا دخل ہوگا۔ نہ وہاں مذہبی پیشوائیت بار پاسکے گی۔ اقبالؒ نے کہا تھا کہ "اسلام میں اطاعت اور وفا شعاری، خدا کی ذات کی ہے۔ تخت و تاج کی نہیں۔" (خطبات ص۱۶۱)

قائداعظمؒ نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ اسلامی مملکت کی بنیادی خصوصیت کیا ہے؟ (۱۹۴۱ء میں حیدر آباد دکن میں) فرمایا کہ

> اسلامی مملکت کی یہ امتیازی خصوصیت ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے، نہ پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے لفظوں میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو لا محالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

پھر انہوں نے (اہل امریکہ کے نام اپنے براڈکاسٹ میں)، واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ پاکستان میں

مذہبی پیشوائیت کے اقتدار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

اس سے آپ نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے تحریکِ پاکستان کی اس قدر مخالفت کیوں ہوئی تھی ـــ! لیکن ان کی اس قدر مخالفت کے باوجود پاکستان بن گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دنیا کیا دیکھتی ہے کہ مذہبی پیشوائیت زناٹے سے یہاں آدھمکی۔

یہاں پہنچ کر بھی انہوں نے اپنے موقف کو چھوڑا نہیں۔ ان کی برابر کوشش جاری رہی کہ یہاں دین کا نظام قائم نہ ہونے پائے، وہی ثنویت باقی رہے۔ علامہ اقبالؒ ۱۹۳۸ء میں وفات پا چکے تھے۔ قوم کی بدقسمتی کہ قائداعظمؒ بھی ۱۹۴۸ء میں دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اس سے مذہبی پیشوائیت کو کھل کھیلنے کا موقعہ مل گیا۔ یہاں اس پیشوائیت کے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جو (بربنائے جہالت ہی سہی لیکن بہرحال) نیک نیتی سے سمجھتا ہے کہ اگر عقاید، عبادات اور پرسنل لاز' علماء کے زیرِ اقتدار رہیں، اور باقی امورِ مملکت' ارباب سیاست کے ہاتھ میں' تو اسلام کا منشار پورا ہوجاتا ہے۔ اس کے لئے ان کی دلیل یہ ہے کہ ثنویت کا تمسک' ان کے اسلاف سے مسلسل چلا آرہا ہے۔ اور اسلاف کے مسلک سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر ہونا کفر و ارتداد ہے۔ ان کے نزدیک اسلاف کے مسلک کا قدم بقدم اتباع کس قدر ضروری ہے اس کا ایک تاریخی واقعہ سے اندازہ لگائیے۔ ہماری سب سے پہلی (اور بڑی) جامع مسجد' دمشق میں بنی امیہ کے زمانے میں تعمیر ہوئی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد' چند انجینئروں نے علمِ ریاضی کی رُو سے دیکھا کہ اس مسجد کا رُخ صحیح طور پر جانب کعبہ نہیں۔ انہوں نے اس کی ایک رپورٹ مرتب کی جو علماء کرام کی ایک مجلس میں پیش ہوئی۔ انہوں نے اس پر لمبی چوڑی بحث و گفتگو کی۔ اور اس کے بعد فتوٰے دیا کہ ہوسکتا ہے کہ یہ انجینئر اپنے حساب کی رُو سے درست ہی کہتے ہوں لیکن اگر ان کی بات صحیح تسلیم کرلی جائے تو اس سے یہ ماننا پڑے گا کہ ہمارے اسلاف کی اس قدر نمازیں باطل تھیں۔ ہم ان انجینئروں کی خاطر اپنے اسلاف کے متعلق یہ کہنے کے لئے تیار نہیں جس رُخ پر ان لوگوں نے نمازیں پڑھیں، اسی رُخ پر ہم نمازیں پڑھیں گے۔ اس لئے کہ ـــ کل خیر فی اتباع السلف ـــ " تمام نیکیاں اتباعِ سلف میں ہیں۔" چنانچہ اس مسجد کا رُخ وہی رہا۔ اور اس کے بعد' اس مسجد کو معیار قرار دے کر جس قدر مساجد تعمیر ہوئیں' سب کا رُخ غلط رہا ـــ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو فقہ حنفی کی معتبر کتاب ــ شامی) ـــ

یہ ہے ان کے نزدیک اتباعِ سلف کی اہمیت' اسی اہمیت کو برقرار رکھنے کے لئے آپکو ہر جمعہ (اور عیدین) کے خطبہ میں ہر منبر سے' یہ الفاظ سنائی دیں گے ـــ کل بدعة ضلالة۔ وکل ضلالة فی النار۔ ہر نئی بات گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں لے جاتی ہے۔

بہر حال، ہم کہہ یہ رہے تھے کہ اگر یہاں اسی ثنویت کو برقرار رکھا جائے (جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا لیکن جو اسلاف سے متواتر چلی آرہی ہے) تو یہ گروہ مطمئن ہو جائے گا۔

لیکن دوسرا گروہ اس سے آگے جاتا ہے۔ اور یہ ہے جماعت اسلامی کا گروہ۔ ان کی منطق بڑی دلچسپ اور شاطرانہ ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ۔

(۱) پاکستان، اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے۔

(۲) اسلام میں مذہب اور سیاست میں ثنویت نہیں۔ لہٰذا، یہاں کی زمامِ اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں ہونی چاہیئے جو امورِ مذہب اور معاملاتِ سیاست دونوں پر عبور رکھتے ہوں۔

(۳) یہاں کے اربابِ سیاست، مذہب سے بیگانہ ہیں ۔۔۔ اور

(۴) مذہبی علماء امورِ سیاست سے نابلد۔

(۵) جماعت اسلامی کا امیر اور اس کے رفقاء، مذہب اور سیاست، دونوں پر حاوی ہیں، لہٰذا،

(۶) اقتدار کی کرسیاں ان کے لئے خالی ہو جانی چاہئیں۔

لیکن اس مطالبہ سے یہ خطرہ لاحق ہوتا تھا کہ مولویوں کا وہ گروہ جو (کم از کم) پرسنل لاء کی حد تک اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہے، وہ اس کی مخالفت کرے گا۔ اس کے لئے، اس جماعت نے یہ راستہ اختیار کیا کہ

> پرسنل لاز ہر فرقے کے اپنے اپنے ہوں۔ اور ان کا فیصلہ متعلقہ فرقے کے علماء حضرات خود کریں۔

یعنی ایک طرف یہ بھی دعوٰے کیا جا رہا ہے کہ اسلام میں دین اور دنیا میں کوئی مغائرت نہیں اور دوسری طرف یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ پرسنل لاز، علماء کے ہاتھ میں رہیں۔ اور پبلک لاز مملکت کے زیر اقتدار! کیا یہ وہی ثنویت نہیں جسے اسلام نے مٹایا تھا اور جو ہمارے ملوکیت کے زمانے میں پیدا ہوئی تھی؟ کیا عہد رسالتمآبؐ اور زمانہ خلافتِ راشدہ میں، پبلک لاز اور پرسنل لاز میں اس قسم کی تفریق ہوا کرتی تھی؟

آپ شاید یہ کہدیں کہ اس حد تک تو بہر حال یہ لوگ صحیح کہتے ہیں۔ کہ جب یہاں اسلامی حکومت قائم ہونی ہے تو اس کے چلانے والے بہر حال وہ لوگ ہونے چاہئیں جو امورِ شریعت سے واقف ہوں۔ (یہی ہے وہ بہت بڑا مغالطہ جس کی وجہ سے عوام ان کے فریب میں آجاتے ہیں۔) اس سلسلہ

میں سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ یہ کہاں سے لازم آتا ہے کہ امورِ شریعت سے واقفیت" مولانا حضرات" کی اجارہ داری ہے۔ کوئی "مسٹر" اس علم کو حاصل نہیں کر سکتا؟ ـــــ اس وقت پرسنل لا کے متعلق جو مقدمات عدالتوں میں پیش ہوتے ہیں (اور خود علماء حضرات بھی اپنے مقدمات کے فیصلے انہی عدالتوں سے کراتے ہیں) ان کے فیصلے، قانونِ شریعت کے مطابق، وہ جج صاحبان کرتے ہیں جن میں کوئی بھی "مولانا" نہیں ہوتا، سب "مسٹر" ہوتے ہیں۔ انہیں قانونِ شریعت پر کس قدر عبور حاصل ہوتا ہے۔ اس کی ایک جھلک خلع سے متعلق اس فیصلہ میں دیکھی جا سکتی ہے جو ابھی پچھلے دنوں سپریم کورٹ سے صادر ہوا تھا۔ اور جسے اخبارات نے کئی اقساط میں اپنے ہاں شائع کیا تھا۔ پھر ان مقدمات کی پیروی بھی وہ وکلاء حضرات کرتے ہیں جو بہرحال "مسٹر" ہی ہیں۔ یہ وہ "مسٹر" ہیں جنہیں جماعتِ اسلامی کے امیر صوبہ مغربی پاکستان (میاں طفیل محمدؐ صاحب) نے اگلے دنوں (ساہیوال بار کونسل سے خطاب کرتے ہوئے) امام اعظمؒ، امام محمدؒ، اور امام یوسفؒ، کی مسندوں کا وارث قرار دیا تھا۔ ان وکلاء میں (ہمارے علم میں) ایسے ایسے ماہرینِ علومِ شریعت موجود ہیں کہ ان کی (مشعبہ عربی) کی لائبریری کو دیکھ کر بڑے بڑے علماء انگشت بدنداں رہ جائیں۔ لیکن یہ کبھی انہیں علماء میں شمار نہیں کریں گے

(بفرضِ محال) اگر ان لوگوں کا اس وقت کا علمِ امورِ شریعت ناقص ہے تو کیا ملک میں ایسا انتظام نہیں کیا جا سکتا کہ "مسٹر" لوگ اس علم کو بہ تمام و کمال حاصل کر لیں؟ لیکن ان اربابِ شریعت کے نزدیک تو کسی مولانا کو مسٹر کہہ دینا، گالی کے مرادف ہے۔ چنانچہ میاں طفیل محمد صاحب نے اپنے اس خطاب میں جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، حکومت کے جن مظالم کا تذکرہ کیا، ان میں ایک ظلم یہ بھی تھا کہ

> پچھلے دنوں علماء گرفتار کئے گئے تو انہیں "مسٹر" کے خطاب سے نوازا گیا۔
>
> (ایشیا۔ ۱۵ اپریل ۱۹۶۷ء)

لیکن یہاں سوال "مسٹر اور مولانا" کا ہے ہی نہیں۔ ان کے ہاں، علومِ شریعت میں مہارتِ تامہ علماء کے گروہ کو بھی حاصل نہیں۔ یہ صرف ایک فرد کے حصے میں آئی ہے۔ اور وہ ہیں امیرِ جماعت سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔ چنانچہ ان کا اپنا ارشاد ہے کہ

> جس شخص کو اللہ تعالیٰ تفقہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے۔ اس کے اندر قرآن اور سیرت کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے، جس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی

نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے۔ اس کی نظر بہیئتِ مجموعی شریعت حقہ کے پورے سسٹم پر ہوتی ہے۔ اور وہ اس سسٹم کی طبیعت کو پہچان جاتا ہے۔ اس کے بعد جب جزئیات اس کے سامنے آتے ہیں تو اس کا ذوق اسے بتا دیتا ہے کہ کونسی چیز اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے اور کون سی نہیں رکھتی ..... اسلام کا مزاج عین ذاتِ نبویؐ کا مزاج ہے۔ جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ وہ نبی اکرمؐ کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت اسے بتا دیتی ہے کہ ان میں کون سا قول یا کون سا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے اور کون سی چیز سنتِ نبویؐ سے اقرب ہے۔ یہی نہیں۔ بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنت سے کوئی چیز نہیں ملتی ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے، کہ اگر نبی صلعم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش ہوتا، تو آپؐ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ اس لئے کہ اس کی روح، روحِ محمدی میں گم اور اس کی نظر بصیرتِ نبویؐ کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔

(تفہیمات۔ حصہ اول۔ صفحہ ۳۲۹، ۳۲۳، ۵۹ ایڈیشن)

— اور جماعتِ اسلامی کے ذمہ دار ارکان اس کا اعتراف و اعلان کر چکے ہیں کہ اس دور میں اس قسم کے "مزاج شناس رسول" مودودی صاحب ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ مذہبی پیشوائیت، خدا اور رسولؐ کے نام پر کس قسم کی مستبدانہ ڈکٹیٹرشپ قائم کرنے کی فکر میں ہے۔

اس سے آپ نے یہ بھی تو دیکھ لیا ہوگا کہ اسلام میں دین و دنیا کی وحدت کے جس اصول کو علامہ اقبالؒ نے پیش کر کے پاکستان کا تصور دیا تھا، یہ حضرات اس اصول کو کس طرح اپنے حق میں (EXPLOIT) کر رہے ہیں۔ یعنی انہوں نے اس مقصد کے لئے پاکستان کا تصور دیا تھا کہ یہاں اسلامی مملکت وجود میں آئے۔ اور مذہبی پیشوائیت باقی نہ رہے۔ اور ان کی کوشش یہ ہے کہ یہاں مذہبی پیشوائیت کی حکمرانی ہو، اسلامی مملکت وجود میں نہ آنے پائے — ان کی اس وقت بھی کیفیت یہ ہے کہ حکومت کوئی قانون اور ضابطہ بنائے، یہ اس کی مخالفت اور (بعض اوقات) خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اس پر جب حکومت ان پر گرفت کرتی ہے، تو یہ شور مچا دیتے ہیں کہ یہ معاملہ مذہبی ہے (کیوں کہ اسلام میں سیاست، مذہب سے الگ ہے ہی نہیں) اور چونکہ ہمیں مذہبی آزادی حاصل ہے، اس لئے ہمیں حق حاصل کہ ہم ہر اس بات

کی مخالفت کریں جسے ہم خلافِ مذہب سمجھتے ہوں۔ یعنی وہی اصول جسے مذہبی پیشوائیت کو مٹانے کے لئے پیش اور اختیار کیا گیا تھا، اب اسی اصول کو مذہبی پیشوائیت کی گرہیں مضبوط کرنے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔

لیکن 'مذہبی پیشوائیت کے خلاف ہمارا یہی اعتراض نہیں۔ بات اس سے کہیں آگے جاتی ہے (جیسا کہ علامہ اقبالؒ نے کہا ہے) اللہ تعالیٰ نے ختم نبوت سے نوعِ انسان کو بہت بڑی آزادی سے ہمکنار کیا ہے۔ اس نے (خدا نے) کہا کہ انسانی زندگی کو جن ضوابط کے تابع رہنا چاہیئے، وہ سب اس کتاب میں محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے، انسانوں کو آزادی ہے کہ وہ ہر زمانے میں اپنے معاملات کا حل آپ دریافت کریں۔ کسی کو ان کی اس آزادی کے سلب کر لینے کا حق حاصل نہیں ہے اس حقیقت کو اقبال رحمۃ اپنے خطبات میں) ان حسین اور جامع الفاظ میں بیان کیا ہے۔

> اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کُلی کی روحانی اساس ازلی وابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیرات کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں ثبات و تغیر میں امتزاج پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں .... لیکن اگر ان ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے، کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان ہی نہیں .... تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے یکسر منجمد ہو کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں ہے۔ اس کے برعکس گزشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر دیا ہے۔ (ص ۱۶۰)

یہ ہے دین اور مذہبی پیشوائیت کی کشمکش کی دوسری بنیادی شق — دین، انسان کی زندگی کو متحرک رکھتا ہوا آگے لئے جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ، دین کے پیروؤں کو اپنے زمانے کا امام (لیڈر) قرار دیتا ہے لیکن مذہبی پیشوائیت زندگی کے پاؤں میں زنجیریں ڈال کر اسے صدیوں پیچھے لے جاتی ہے۔

اور ایک قدم بھی آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دیتی۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب فسادات پنجاب کی تحقیقاتی کمیٹی نے یہ سوال کیا تھا کہ اسلامی مملکت میں قانون سازی کی کس حد تک اجازت ہو گی، تو علماء کرام کی طرف سے اس کا کیا جواب ملا تھا۔ اس گروہ کے نمائندہ مولانا ابوالحسنات صاحب، صدر جمعیت العلماء پاکستان نے فرمایا تھا کہ

> (اسلام میں اس کی قطعاً اجازت نہیں)۔ ہمارا قانون مکمل ہے۔ بس اس کی تعبیر کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ ان لوگوں کا کام ہے جو اس کی مہارت رکھتے ہیں۔ میرے عقیدے کے مطابق، ایسا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا جس کے متعلق قرآن اور حدیث میں قانون موجود نہ ہو۔

مولانا مودودی صاحب نے اس پر اتنا اضافہ کیا کہ

> جن معاملات میں قرآن، سنت یا سابقہ اجماع کا کوئی تعیلہ نہ ملے صرف ان کے لیے نئے قوانین بنائے جا سکتے ہیں۔　　(صلالہ)

اس سے آپ اندازہ فرمائیے کہ اگر پاکستان میں مذہبی پیشوائیت کا اقتدار قائم ہو جائے تو یہ ہمیں کس مقام پر لے جا کر باندھ دے گی۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی۔ کہ پاکستان میں:-

(۱) مذہبی پیشوائیت کا ایک گروہ اس پر مطمئن ہو سکتا ہے کہ پرسنل لاز ان کی تحویل میں دے دیئے جائیں۔ اور امور مملکت، ارباب سیاست کے زیر اقتدار رہیں۔ دین اور دنیا کی یہ وہ ثنویت ہے جس سے اسلام کی بیخ کٹ جاتی ہے۔

(۲) ایک گروہ ایسا ہے۔ (اور یہ زیادہ مؤثر گروہ ہے) جس کا موقف یہ ہے کہ پرسنل لاز ہر فرقے کے علماء کی تحویل میں رہنے دیئے جائیں۔ اور پبلک لاز ان کی تحویل میں دے دیئے جائیں۔ حقیقت کے اعتبار سے یہ بھی وہی ثنویت ہے جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔

(۳) ایک گروہ کا کہنا یہ ہے کہ اسلام میں تمام قوانین پہلے سے موجود ہیں۔ حکومت کا کام (علماء کے مشورے سے) ان قوانین کو نافذ کرنا ہوگا۔ اور بس۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حال ہی میں احتشام الحق صاحب تھانوی نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ "اسلامی اصول اور اسلامی احکام کی تشریح و توضیح میں رائے عامہ یا حکام کی مرضی کو مطلق کوئی دخل نہیں ہے۔ ماہرین علوم شریعت

کا قول، قولِ فیصل ہے۔ اور ان کی رائے آخری رائے ہے۔" (ایشیا - بابت ۹ رمئی ۱۹۷۶ء) ـــــ

واضح رہے کہ آئین کی رُو سے "قولِ فیصل یا آخری رائے" کو اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY) کہا جاتا ہے۔ یہی ان حضرات کا مطالبہ ہے۔

(۴) ایک گروہ کا کہنا ہے کہ نہیں، کچھ ایسے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں جن کے لئے پہلے سے قوانین موجود نہیں۔ ان کے لئے (اور صرف اس حد تک) جدید قوانین مرتب کئے جا سکیں گے اور اس کا اختیار بھی علماء ہی کو ہو گا۔

(۵) مودودی صاحب کا کہنا یہ ہے کہ قوانین قدیم ہوں یا جدید، اس امر کا فیصلہ صرف "مزاج شناسِ رسولؐ" کر سکے گا کہ ان میں سے کون سا قانون اسلام کے مطابق ہے اور کون سا اس کے خلاف!

اور جماعت اسلامی کا عقیدہ ہے کہ یہ "مزاج شناسِ رسول" خود مودودی صاحب ہیں چنانچہ یہ لوگ آج بھی ان کی اطاعت کو "خدا و رسولؐ کی اطاعت" قرار دیتے ہیں۔ اس کے متعلق مودودی صاحب نے نومبر ۱۹۵۱ء میں کراچی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

> اسلامی نقطۂ نظر سے اقامتِ دین کی سعی کرنے والی جماعت میں جماعت کے اولی الامر کی اطاعت فی المعروف دراصل اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کا ایک جزو ہے۔ جو شخص اللہ کا کام سمجھ کر یہ کام کر رہا ہے، اور اللہ ہی کے کلام کی خاطر جس نے امیر کو مانا ہے، وہ اس کے جائز احکام کی اطاعت کر کے دراصل اس کی نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے۔ (ہدایات صفحہ ۳۷)

ان کا یہ امیر، پوری جماعت تو ایک طرف، اپنی مجلسِ شوریٰ کی اکثریت کے فیصلے کا بھی پابند نہیں اس کا فیصلہ یہ ہے کہ

> امیر کو مجلسِ شوریٰ کی اکثریت کے مقابلہ میں ویٹو کا حق حاصل ہونا۔ (دستوری خاکے صفحہ ۲)

یہ ہے وہ مذہبی پیشوائیت جس کی اصولی مخالفت کو طلوعِ اسلام، دین کا تقاضا سمجھتا ہے۔ اور یہ ہیں وہ دلائل و وجوہات جن کی بنا پر وہ اس باب میں ان سے کوئی مفاہمت نہیں کر سکتا۔ اس کے نزدیک، اسلام اور مذہبی پیشوائیت ایک دوسرے کی ضد ہیں اور کبھی ایک جگہ

اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ اگر پاکستان کو دینی مملکت بننا ہے، تو اسے مذہبی پیشوائیت کو ختم کر دینا ہوگا۔

مذہبی پیشوائیت کی طرف سے یہ کچھ ہو رہا ہے۔ دوسری طرف اربابِ حکومت ہیں ان کی کیفیت یہ ہے کہ تشکیلِ پاکستان سے لے کر اس وقت تک جتنی حکومتیں برسرِ اقتدار آئیں ہیں، ان میں سے ہر ایک نے اس ثنویت کو قائم رکھنے اور مستحکم بنانے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔ مذہبی پیشوائیت کے متعلق ان کی پالیسی مصالحانہ ہی نہیں، بلکہ مغلوبانہ رہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی قوت دن بدن بڑھتی چلی گئی۔ اور آج حالت یہ ہے کہ ملک کی فضا پر یہ لوگ پوری طرح چھا چکے ہیں۔ اگر کوئی حکومت اپنے مفاد اور استحکام کی خاطر کوئی مسلک اختیار کرنا چاہتی ہے تو یہ اس کی اپنی مصلحت ہے۔ لیکن ہمیں جس بات پر اعتراض ہے، وہ یہ کہ ایک طرف حکومت اس ثنویت کی گرہیں مضبوط سے مضبوط تر کئے جاتی ہے اور دوسری طرف اس کی طرف سے لٹھتے بیٹھتے یہ اعلانات ہوتے رہتے ہیں کہ اسلام میں اس ثنویت کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ اس دورخی پالیسی کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔

پس چہ باید کرد!

اس مقام پر آپ کے دل میں یقیناً یہ سوال پیدا ہوگا کہ ان حالات میں ہمارے لئے فلاح کی راہ کیا ہے؟ — یہ ایسا سوال نہیں جس کے جواب کے لئے کسی افلاطون کے فلسفہ کی ضرورت ہو — بات بالکل صاف اور واضح ہے۔ اگر یہاں کسی کے دل میں فی الواقعہ اس کی تڑپ موجود ہے، کہ یہ مملکت صحیح معنوں میں اسلامی مملکت بن جائے، تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کو ختم کر دیا جائے۔ ملوکیت کو ختم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ مملکت آئینی طور پر اس کا اعلان کرے کہ مملکت کا تمام کاروبار خدا کی کتاب (قرآن کریم) کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائیگا۔ اور ملک میں کوئی قانون اس کے خلاف رائج نہیں ہوگا۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اسلامی مشاورتی کونسل کو اس طرح از سرِ نو متشکل کرے کہ وہ ان حضرات پر مشتمل ہو جو عصرِ حاضر کے تقاضوں سے پوری طرح واقف ہوں — قانون میں ماہرانہ بصیرت رکھتے ہوں اور قرآن کریم پر ان کی نگاہ بڑی گہری ہو۔ وہ ہر پیشِ نظر معاملہ کے متعلق یہ بتائیں کہ اس باب میں قرآن کا حکم یا راہ نمائی کیا ہے اور بحالاتِ موجودہ اس پر عمل کرنے کی امکانی صورت کیا — پارلیمان کا کام یہ ہو کہ وہ اس اصولی راہ نمائی کی جزئیات پر غور و خوض کرے اور اس طرح رفتہ رفتہ ملک کو اس منزل کی طرف لے جائے، جو ایک

اسلامی مملکت کا منتہیٰ ہے۔ اس کے ساتھ ہی عدالتِ عالیہ بھی ایسے ججوں پر مشتمل ہو، جنہیں قرآن میں گہری بصیرت حاصل ہو۔ اگر کسی کو، مملکت کے کسی قانون یا فیصلہ پر اعتراض ہو تو وہ اسے عدالتِ عالیہ میں چیلنج کرے۔ اور "علماء" میں سے جو چاہیں وہ اس عدالت میں وکیل کی حیثیت سے پیش ہوں۔ عدالت کا فیصلہ حرفِ آخر ہو اور پھر اس کی مخالفت، قانونی جرم قرار دیجائے ـــــ واضح رہے کہ اسلامی مملکت اور مذہبی پیشوائیت میں فرق یہ ہوتا ہے، کہ اسلامی مملکت میں "قانون جاننے والوں کی حیثیت وکلاء کی ہوتی ہے، لیکن مذہبی پیشوائیت میں" علماء جج کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اسی سے ساری خرابی پیدا ہوتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ روزمرہ کی زندگی کے جن معاملات میں عوام کو مولوی کی ضرورت پڑتی ہے، ان سے متعلق معلومات نہایت آسان اور سادہ زبان میں ایک مختصر سی کتاب میں درج کر کے، اسے اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں داخل کر دیا جائے۔ اور لاء کالج کے داخلہ کے لئے عربی زبان کی واقفیت کو شرط قرار دے کر "قرآنی قوانین کو بطورِ اصل"، اور فقہ کو گزشتہ زمانے میں مسلمانوں کے ہاں رائج قانون کی "تاریخ" کی حیثیت سے پڑھایا جائے۔ اس کے ساتھ ہی، حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ اور خلافتِ راشدہ کی صحیح ترین تاریخ (قرآن کی روشنی میں) مرتب کر کے داخلِ نصاب کر دیجائے۔

اِدھر یہ کیا جائے، اور دوسری طرف الگ مذہبی مدارس کو ختم کر دیا جائے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ موجودہ "ائمہ اور علماء" کی باعزت روٹی کا انتظام حکومت کی طرف سے کر دیا جائے ـــــ جہاں تک ان سے کام لینے کا تعلق ہے، انہیں پرائمری سکولوں میں ٹیچر مقرر کیا جا سکتا ہے، اس شرط کے ساتھ ہی یہ وہاں مقررہ نصاب کے علاوہ اور کسی چیز کی تعلیم نہیں دیں گے۔

یہی ہے وہ طریقہ جس سے یہ مملکت فی الواقعہ اسلامی بن سکتی ہے۔ لیکن اگر کسی میں ان اقدامات کی ہمت نہیں تو پھر (جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے بھی کئی بار عرض کیا ہے،) اس قسم کے دعاوی کو ختم کر دیا جائے، کہ یہاں اسلامی مملکت "قائم ہوگی۔

جیسا کہ ہم شروع میں وضاحت سے لکھ چکے ہیں جس مملکت میں بھی مذہبی پیشوائیت موجود ہوگی وہ مملکت ہمیشہ سیکولر رہے گی، خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے۔ سو اگر مملکت کو اس طرح سیکولر رہنا ہے تو اسے دیانتدارانہ طور پر سیکولر کیوں نہ کہا جائے۔

کہا جائے گا (اور عام طور پر کہا بھی جاتا ہے) کہ اس قسم کا تجربہ اتاترک نے کیا تھا، جو بُری طرح

ناکام ثابت ہو چکا ہے۔ اس لئے اس ناکام تجربہ کو دہرانے کا نتیجہ ناکامی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن اس اعتراض کو پیش کرنے والے ایک بنیادی نقطہ کو نظر انداز کر دیتے ہیں ـــــ اتاترک نے مذہبی پیشوائیت کو تو مٹایا تھا، لیکن اس کی جگہ اس نے مملکت میں دین کا نظام رائج نہیں کیا تھا۔ اگر اس کے سامنے قرآن ہوتا اور وہ وہاں قرآن کی روشنی میں اسلام کا نظام قائم کر دیتا تو وہاں یہ صورتِ حالات کبھی پیدا نہ ہوتی۔ اس نے مذہبی پیشوائیت کو مٹا کر ملک میں خلا پیدا کر دیا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ زندگی خلا میں سانس نہیں لے سکتی۔ مذہبی پیشوائیت کا مٹانا صرف حصہ لا ہے۔ اور اس کی جگہ قرآن کا نظام قائم کرنا حصہ اِلّا ـــ اور یہ واضح ہے کہ ؎

نفیٔ بے اثبات مرگِ امتاں
لا د اِلّا شاد و برگِ امتاں

یہ وجہ تھی کہ وہی اقبال جس نے اتاترک کے اس اقدام کی، کہ اس نے مذہبی پیشوائیت کو مٹایا تھا، اس قدر مدافعت اور حمایت کی تھی، اسے ترکوں سے یہ کہنا پڑا کہ ؎

لادینی و لاطینی، کس پیچ میں اُلجھا تو
دارو ہے ضعیفی کا، لا غالب الّا ھو

"لا غالب الّا ھو" کے معنے یہ ہیں کہ مسلمان کے لئے حاکمیت خدا کی کتاب کی ہو گی۔ انہوں نے اقبال کی اس آواز پر کان نہ دھرا۔ اور یوں ان کا اس قدر جرأت مندانہ اقدام (اِلّا کے نہ ہونے کی وجہ سے) ناکام رہ گیا۔ اسی حقیقت کو (علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے) اپنے خطبات میں ان بصیرت افروز الفاظ میں پیش کیا ہے کہ

> وہ سب سے بڑا سوال جو زود یا بدیر مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے، یہ ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جد و جہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات (ہاں) میں ہونا چاہیئے بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب تھا۔ اور جسے رسول اللہ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ ـــــ

"حسبنا کتاب اللہ"

ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔

دنیا میں اسلامی مملکت وہی صاحب عزیمت قائم کر سکے گا جس میں یہ کہنے کی جرأت ہو کہ

ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔

یہی وہ جواب تھا جو خدا کی طرف سے اسلامی نظام کے مخالفین کو دیا گیا تھا۔ جب اس نے کہا تھا کہ

أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ ۔ (۲۹/۵۱)

کیا یہ بات ان کے لئے کافی نہیں کہ ہم نے (اے رسولؐ!) تجھ پر وہ کتاب نازل کی ہے جسے ان کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔

اور یہی تھا اعلان جو اس ذاتِ اقدس و اعظم نے اس وقت کیا تھا جب اس کے مقدس ہاتھوں سے اسلامی مملکت کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔ کہ

لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ ۔ (بحوالہ تاج العروس)

جو اپنے لئے قرآن کو کافی نہیں سمجھتا، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

طلوعِ اسلام کا مسلک و مقصد

۱۔ قرآنِ کریم مسلمانوں ہی کے لئے نہیں، بلکہ تمام نوعِ انسان کے لئے خدا کی طرف سے آخری، مکمل اور محفوظ ضابطۂ ہدایت ہے۔ اسے سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے عملاً متشکل کر کے دکھایا۔ اس لئے حضورؐ کی سیرت کے نقوشِ قدم اسلامی زندگی کے لئے نشانِ راہ ہیں۔

۲۔ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے متعلق جو باتیں ہماری کتب روایات و تاریخ میں آئی ہیں۔ ان میں سے وہی صحیح ہو سکتی ہیں جو قرآنِ کریم کے خلاف نہ ہوں۔

۳۔ جو حکومت، قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کو ملک میں عملاً نافذ کرے گی، اسے خلافت علیٰ منہاج نبوت، یا اسلامی مملکت کہا جائے گا۔

۴۔ اس مملکت کا بنیادی فریضہ یہ ہوگا کہ وہ تمام افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی ــــ خوراک، مکان، لباس، علاج وغیرہ ــــ بہم پہنچائے اور ان کی انسانی صلاحیتوں کے نشوونما پانے کا انتظام کرے۔

۵۔ اسلامی مملکت میں ملوکیت (یعنی خدا کے قوانین کے بجائے انسانوں کے خود ساختہ قوانین کا عمل)، تھیاکریسی (یعنی قانون کے معاملہ میں مذہبی پیشواؤں کے حکم کا قولِ فیصل سمجھے جانا) اور سرمایہ داری (یعنی رزق کے سرچشموں پر امت کی بجائے افراد کا قبضہ و اقتدار) نہیں ہوگا۔

۶۔ اسلامی مملکت میں مناصب و مدارج کا معیار جوہرِ ذاتی اور پختگیٔ سیرت و کردار ہوگا۔

۷۔ طلوعِ اسلام پاکستان میں اسی قسم کے اسلامی نظام کے قیام کے لئے فکری اور آئینی کوشش کرتا ہے۔ اس کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے اور نہ ہی کسی مذہبی فرقہ سے، نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ ایجاد کرنا چاہتا ہے۔ کیوں کہ فرقہ بندی قرآنِ کریم کی رو سے شرک ہے۔ امت کے موجودہ فرقے جس طرح نماز، روزہ وغیرہ اسلامی شعائر کے پابند ہیں، یہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرتا کیوں کہ اس سے ملت میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔

۸۔ اگر آپ ان مقاصد سے متفق ہیں تو طلوعِ اسلام کی قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں اس کا ساتھ دیجئے۔

(ناظم)

سی۔آئی۔اے اور پاکستان

آجکل (ماسکو ریڈیو کے حوالے سے) اخبارات میں یہ خبر گشت لگا رہی ہے کہ سی۔آئی۔اے کیطرف سے یہاں کی ایک جماعت کو اس قدر روپیہ ملا ہے۔ اس پر یہاں حسب معمول قیاس آرائیاں شروع ہو گئیں۔ حتےٰ کہ، پاکستان نیشنل عوامی پارٹی کے جائنٹ سیکرٹری محی الدین احمد صاحب نے ڈھاکہ میں ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ جماعت اسلامی کو سی۔آئی۔اے کی طرف سے حال ہی میں ساٹھ لاکھ روپیہ ملا ہے۔ اور اس سے پہلے وہ غلافِ کعبہ تیار کرانے کے بہانے پچیس لاکھ روپیہ ہضم کر گئی ہے۔ (بحوالہ امروز۔ ۴ مئی)

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ مسئلہ ایسا اہم اور نازک ہے کہ اس کے متعلق قیاس آرائیوں سے ہرگز کام نہیں لینا چاہیئے۔ اس کے متعلق حکومت کو چاہیئے کہ وہ تحقیق کرے کہ ماسکو سے نشر شدہ خبر میں کہاں تک صداقت ہے۔ اور اگر وہ خبر صحیح ہے تو پھر حکومت ہی اس کی تحقیق و تفتیش کرے کہ وہ جماعت کون سی ہے جو اس طرح ایک بیرونی ملک کے جاسوسی ادارہ سے سازباز رکھتی ہے۔

اس سلسلہ میں البتہ، مؤقر جریدہ چٹان نے۔ لاہور نے اپنی ۱۵ مئی کی اشاعت کے اداریہ میں ایک ایسی اصولی بات کہی ہے جس پر توجہ دینا نہایت ضروری ہے۔ اس نے لکھا ہے۔

> غیر ملکی حکومتوں سے گفتگو کرنے اور اس کے ساتھ روابط پیدا کرنے کا حق صرف ملک کی حکومت کو ہوتا ہے۔ اگر کسی ملک کی کوئی جماعت اپنے طور پر یہ اقدام کرتی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے ملک کی نہیں بلکہ کسی اور ملک کی گماشتہ ہے۔

یہ بڑی اصولی بات ہے کہ کسی ملک کی کسی جماعت کو اس کا حق نہیں کہ وہ کسی غیر ملکی حکومت سے گفتگو کرنے یا رابطہ پیدا کرنے کا اقدام کرے۔ یہ حق صرف اس ملک کی حکومت کا ہوتا ہے۔ ہم نے بعینہٖ یہی

بات آج سے قریب گیارہ برس پہلے، نہایت کھلے الفاظ میں کہی تھی ــــ اواخر ۱۹۵۵ء کی بات ہے کہ مملکت پاکستان امریکی بلاک میں شامل ہونے کے سوال پر غور کر رہی تھی ــ عین اس وقت، مودودی صاحب نے کراچی میں اپنی ایک تقریر میں، امریکن بلاک کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

> اگر یہ بلاک فی الواقعہ یہ چاہتا ہے کہ کمیونزم کی روک تھام کے لئے اسے مسلم عوام کا دلی تعاون حاصل ہو تو اسے اپنی بنیادی پالیسی میں بنیادی تغیر کرنا پڑے گا۔ اسے یہ فیصلہ کرنا ہوگا، کہ اسے مسلم ممالک کے حکمرانوں سے ساز باز کرنا ہے یا مسلم ممالک کے عوام کا تعاون حاصل کرنا ہے۔ اس کے سوچنے کا کام ہے، کہ اسے کون سی راہ اختیار کرنی چاہیئے۔ اسے ان حکمرانوں کی ضرورت ہے جو عوام پر کسی اثر بھی نہیں رکھتے یا عوام کے تعاون کی ضرورت ہے۔ جو طاقت کا اصل سرچشمہ ہوتے ہیں۔ پچھلی جنگِ عظیم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ حکومت خواہ کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو، پوری طاقت نہیں لگا سکتی جب تک ملک کے باشندے اس جنگ کو اپنی جنگ نہ سمجھیں۔ بلکہ اگر معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے تو ملک کے باشندے جابر حکمرانوں سے نکلنے کے لئے اس موقعہ سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

یہ تقریر، اسلامی جماعت کے آرگن، تسنیم کی ۱۶ر دسمبر ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے چند دن بعد، مودودی صاحب نے لاہور کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

> اس سلسلہ میں دوسری بات یہ ہے کہ خود اینگلو امریکی بلاک کو بھی سوچنا چاہیئے کہ اگر وہ صرف مسلمان حکمرانوں سے معاملہ کرنا چاہتا ہے، اور اس کو مسلمان قوم کے ساتھ کوئی معاملہ نہیں کرنا ہے تو الگ بات ہے۔ لیکن اگر اس کی خواہش یہ ہے کہ مسلمان ممالک کے عوام بھی اس کے ساتھ تعاون کریں تو اس معاملہ میں ہمیں وضاحت سے بتا دینا چاہیئے کہ مسلمان ملکوں کے ساتھ آپ کی جو پالیسی اب تک چلی آرہی ہے، وہ ایسی ہرگز نہیں کہ پاکستان اور دوسرے ممالک کے عوام کا دلی تعاون آپ کو حاصل ہو سکے۔
>
> (تسنیم ۲۰ر دسمبر ۱۹۵۵ء)

ہم نے اس پر اسی زمانے میں گرفت کی تھی۔ اور ۳۱ر دسمبر ۵۵ء کے ہفتہ وار طلوع اسلام میں)

لکھا تھا، کہ پاکستان کے اندر رہتے ہوئے، کسی بیرونی ملک سے یہ کہنا کہ تم ملک کے حکمرانوں سے معاملہ نہ کرو، بلکہ ملک کے عوام سے معاملہ کرو، مملکت کے خلاف کھلی ہوئی بغاوت ہے۔ اور یہ ظاہر تھا، کہ "ملک کے عوام" کے ساتھ رابطہ بہرحال اس ملک کے عوام کے نمائندوں کی وساطت ہی سے کیا جا سکتا تھا۔ اور اس نمائندگی کے لئے جماعت اسلامی اپنے سے بہتر اور کسے اہل سمجھتی تھی اور سمجھتی ہے۔ یہ تھا وہ سازشی خیال جو اُس زمانے میں، مودودی صاحب کی طرف سے امریکن بلاک کے دل میں ڈالا گیا تھا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ امریکن بلاک نے اس تجویز کو کہاں تک درخورِ اعتنا سمجھا۔ لیکن، جیسا کہ معاصر چٹان نے لکھا ہے، کسی ملک کی کسی جماعت کا، کسی دوسرے ملک سے یہ کہنا کہ تم اس ملک کے حکمرانوں سے معاملہ نہ کرو، بلکہ اس کے عوام سے براہ راست معاملہ کرو، بہت بڑی سازش ہے۔ ہم سمجھتے ہیں، کہ حکومت کے پاس یقیناً ایسے ذرائع ہوں گے جن سے وہ یہ معلوم کر سکے کہ امریکن بلاک نے مودودی صاحب کے اس اشارہ کا کیا اثر لیا تھا۔

ہم حکومت سے گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ سی۔ آئی۔ اے کے متعلق ملک میں جو افواہیں پھیل رہی ہیں، فضا کو ان سے پاک کرنا نہایت ضروری ہے۔ اگر وہ اپنی تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان افواہوں میں کوئی صداقت نہیں، تو مستند طور پر اس کا اعلان کر دے، تاکہ ملک سے وسوسہ انگیزیوں کا سلسلہ ختم ہو جائے۔ اور اگر وہ کسی جماعت کو اس سے ملوّث پائے، تو اس کا بھی واضح الفاظ میں (نام لیکر) اعلان کر دے تاکہ بے گناہ جماعتیں مفت کی بدظنی سے بچ جائیں اور مجرم جماعت کسی کو دھوکا نہ دے سکے۔ ہم اس وقت بڑے نازک دور سے گزر رہے ہیں، اس لئے ملک کو جس قدر بیرونی خطرات سے محفوظ رکھنا ضروری ہے، اسے اندرونی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رکھنا اس سے بھی کہیں زیادہ ضروری ہے۔

(دحروزہ - ۱۷ مئی ۱۹۶۷ء)

حالاتِ حاضرہ پر

قرآنِ کریم کی روشنی میں ـــــ بے لاگ تبصرہ کے لئے

رسالہ "طلوعِ اسلام" کا مطالعہ فرمائیں!

قرآن سمجھنے کے لئے ـــ پرویز صاحب کی تصانیف ـــ دیکھیں۔ ان میں

آپ کو ـــ عقل اور وحی کا صحیح امتزاج ـــ دکھائی دیگا۔

ناظم

خورشید عالم

افریقہ ایشیا کا عالمی کردار

ایشیا، افریقہ اور یورپ تینوں براعظم تاریخ اور جغرافیہ دونوں کے رشتوں میں منسلک ہیں۔ افریقہ، بظاہر اپنے ہمسایوں سے زمینی طور پر کٹ گیا ہے۔ لیکن اسے ایشیا سے نہر سویز کی آبی لکیر الگ کرتی ہے اور یورپ سے آبنائے جبل الطارق۔ پانی کے یہ راستے ایسے کھلے دروازے ہیں جن سے تاریخ کے رشتے مضبوط تر ہوتے رہے۔ چنانچہ ایشیا میں جو کچھ ہوتا رہا ـــــ اور تاریخ ایشیا ہی میں پیدا ہوئی ـــــ اس کا اثر بلاکم و کاست یورپ اور افریقہ کے سواحل تک پہنچتا رہا۔ اور پھر وہاں سے حالات کے مطابق بتدریج دور اندر تک پھیلتا گیا یہ سلسلہ چلتا رہا تا آنکہ انسان عہدِ یورپ تک پہنچ گیا۔ کہنے کو اسے نئی روشنی اور جدید تہذیب کا عہد کہا گیا۔ لیکن انسان نے بہت جلد زبانِ حال سے کہنا شروع کر دیا ـــــ شامتِ اعمالِ ماصورتِ یورپ گرفت ـــــ اہل یورپ گھروں اور ملکوں سے مشینوں کے زور پر نکلے۔ دن بدن بڑھنے والی اور تیز سے تیز تر چلنے والی مشینوں نے اپنے دھوئیں سے پورے یورپ کو سیاہ پوش کر دیا تھا۔ اس فضا میں صحت مند انفرادی یا اجتماعی زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ جو افرادِ یورپ بیرونِ یورپ پہنچے، ان کے اپنے گھروں اور ملکوں میں ناہمواریاں اور ناانصافیوں کا عام چلن تھا۔ یورپ درونِ در یہ کچھ کر کے بیرونِ خانہ آیا تو مشین پر بیٹھ کر آیا۔ مشین گھوڑا نہ تھی کہ اس کا ہاتھ باگ پر ہوتا اور پاؤں رکاب میں۔ مشین کو چلانے اور چلاتے رکھنے کے لئے اخلاق و اقدار کی ضرورت نہیں، خام مال کی ضرورت تھی۔ یہ مال سمیٹنے کے لئے یورپ پاگلوں کی طرح دنیا کے کونے کونے میں مارا مارا پھرا۔ اس کے اعصاب پر مشین اس بُری طرح سوار تھی کہ انسان کو بھی اس کے نزدیک خام مال سے بہتر یا مختلف درجہ حاصل نہ تھا۔ اس نے دونوں کو مشین کا ایندھن بھرنے کے لئے بے دریغ استعمال کیا۔ اور بری اور بحری قزاقی کو اپنے کردار کا معمول بنایا۔ ایسے میں عالمی سطح پر دہشت کا پھیل جانا بالکل قابلِ فہم تھا۔ کم و بیش دو سو سال تک عالم انسانی پر ایسی دہشت طاری رہی کہ یورپ سے کلو خلاصی امر محال دکھائی دینے

لگی۔

انیسویں صدی کے آخر میں جا کر کہیں کرۂ ارض پر چھائے ہوئے یورپی مشینوں کے سیاہ بادل اِدھر اُدھر سے چھٹتے دکھائی دیئے۔ ۱۸۹۶ء میں اٹلی نے حبشہ کے ہاتھوں شکست کھائی۔ جس طرح حبشہ افریقہ کا کوئی ایسا معروف اور مہذب ملک نہیں تھا۔ اسی طرح اٹلی یورپ کی اعلےٰ قوت نہیں تھا۔ چنانچہ اس تصادم کے خلافِ توقع نتیجے کو چنداں اہمیت حاصل نہ ہو سکی۔ گو یورپ کی عالمگیر برتری کو اس سے صدمہ ضرور پہنچا۔ یورپ کا طلسم ٹوٹنے کے آثار اس صدی کے شروع میں پیدا ہوئے جب ۱۹۰۵-۱۹۰۴ء کی جنگ میں جاپان نے روس کو چین کے علاقے میں شکست دی۔ جاپان انیسویں صدی کے نصفِ اول میں یورپ کے لئے کتابِ مختوم کا درجہ رکھتا تھا۔ ان جزائر نے اپنے دروازے ایسے بند رکھے کہ اہلِ یورپ کی بار بار کی اور بعض اوقات بے پناہ دستک کے باوجود نہ کھلے۔ امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، غرض سب کی نظریں جاپان پر تھیں۔ ایک تو یوں بھی ان کے نزدیک اس ایشیائی ملک اور قوم کو آزاد رہنے کا حق حاصل نہیں تھا۔ دوسرے وہ گدھوں کی طرح چین پر منڈلانے لگے تو انہیں ڈر پیدا ہو گیا کہ چین کی بوٹیاں نوچنے میں کہیں جاپان بھی ان کا شریک یا حریف نہ بن بیٹھے۔ ۱۸۹۵ء میں بہانہ بنا کے وہ جاپان پر چڑھ دوڑے اور طرح طرح سے اہلِ جاپان کی ذلت کے سامان بہم پہنچانے لگے۔ استعمارِ یورپ کا ڈنک کھا کر مشرقِ اقصیٰ کا یہ ملک ایک ہی جست میں قرونِ وسطےٰ سے عہدِ یورپ میں آپہنچا۔ جاپان کو یورپی سطح کی طاقت بننے میں بمشکل تیس سال لگے۔ اس حیران کن ترقی کو دیکھ کر دولِ یورپ نے جاپان کی عظمت کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ دیکھا۔ اور جب روس نے جاپان کے ہاتھوں شکست کھائی تو ایشیا میں مسرت کی عمومی لہر دوڑ گئی۔ اور یہ خیال خام ثابت ہونے لگا کہ یورپ ناقابلِ شکست ہے اور اس کا غلبہ و استیلا انسان کا دائمی مقسوم ہے۔

روس کی شکست کو ایشیا بھر میں یورپ کی پسپائی پر محمول تو ضرور کیا گیا لیکن ایشیا کے اپنے آپ میں آنے کے لئے جاپان کی روس پر فتح بمنزلہ صبحِ کاذب کے تھی۔ اس فتح کے بعد پھر اندھیرا سا چھا گیا۔ کیونکہ جاپان دولِ یورپ کی طرح اپنے ایشیائی ہمسائے چین ہی کے درپے ہو گیا۔ ان سب قوتوں نے چین پر یلغار کر دی اور ایک دوسرے کو کاٹ کھاتے ہوئے جسدِ چین کی بوٹیاں نوچنے میں لگ گئے۔ چین کا تشخص نہ اتفاقی سے ۔۔۔ ، ہزاروں سال کی طویل تاریخ میں تہذیبِ چین نے بڑے نشیب و فراز دیکھے۔ ایسے ایسے نشیب کہ تاریخ کی گرد میں اس کے ہمیشہ کے لئے روپوش ہو جانے کا گمان ہونے لگا۔ لیکن اپنی پائندہ اور محکم بنیادوں کی بدولت یہ تہذیب ڈوب ڈوب کر ابھرتی رہی۔ کہنہ اور بوسیدہ سمجھ کر اس پر چڑھ آنے والے ممالک میں سے کسی ایک کو یہ پائندگی اور محکمی نصیب نہ تھی۔ ان کی برتری کی ذمہ دار سر چکرا دینے والی تیزی سے چلنے والی مشینیں تھیں جن کے لئے "الناس والحجارۃ" یکساں طور پر ایندھن کا درجہ رکھتے تھے۔ اس قدیم لیکن محکم تہذیب سے یورپ کی مشینی تہذیب ٹکرائی۔

تو ایسا شرارِ زندگی پھوٹا کہ یورپ کی آنکھوں میں چکا چوند کر گیا۔ یورپ کے دل کی کدورت البتہ دھل نہ سکی۔ اس پر ابھی کچھ اور وقت لگے گا۔ جیسا کہ امریکہ اور چین کے عالمی کرداروں کا جائزہ لیتے ہوئے بیان کیا جا چکا ہے، اس صدی کی بین الاقوامی سیاست اسی ایک نکتہ کی تفسیر ہے۔ عالمی سیاست کا یہ صبر آزما دور اس وقت تک ختم نہیں ہوگا جب تک یورپی ذہنیت کے مظہرِ مجسم یعنے امریکہ کی آنکھوں کو قدرتی بینائی حاصل نہیں ہو جاتی اور اس کے دل کی کدورت کلیتہً دُھل نہیں جاتی۔ حالات کو اس ڈھب پر لانے کے لئے مشیت سرگرمی سے مصروفِ عمل ہے اور اب صاف دکھائی دے رہا ہے کہ فطرت کے مقاصد کا عیار ایک طرف چین کے ارادے ہیں اور دوسری طرف عالمِ اسلامی کے۔

چین میں اقوامِ یورپ نے جس بے دردی سے مداخلت شروع کر دی تھی، اس کا آہستہ آہستہ یہ نتیجہ نکلا۔ کہ چین میں یورپ کے خلاف رائے بیدار ہونے لگی۔ جاپان نے یورپ کی زد میں آکر یہ بھانپ لیا کہ یورپ کے غلبے کا راز مشینوں میں ہے تو اس نے بھی اپنی توجہ مشینوں پر مرکوز کر دی تھی۔ اس نے یورپ کا تتبع کیا۔ اور مشینی طور پر اس کی سطح پر جا پہنچا۔ اس کا عروج مشینوں کی کارستانی تھی، تہذیب کا کمال نہیں تھا۔ گو وہ جغرافیائی لحاظ سے ایشیائی تھا، تہذیبی رُو سے وہ یورپی بن گیا۔ مستقبل بعید کی میزان میں اس کی ترقی کو ایشیائی ترقی کا ہم پلہ نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ اس کے برعکس چین میں جو انقلاب برپا ہوا، وہ نہ یورپ کے تتبع میں تھا، نہ مشینوں کا لایا ہوا تھا۔ یہ تہذیبِ چین کا سنبھالا تھا جس سے وہ زمانے کے تغیر پذیر تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے قابل ہو گئی۔ یورپ کی نقالی تو ایک طرف رہی، چین میں یورپی ذہنیت اور یورپی اثر و نفوذ کے خلاف ایسی صحت مند تحریک چلی کہ بیرونی یورپی جراثیم سے جسدِ چین پاک اور صاف ہونے لگا۔ اجنبی اثرات سے نجات حاصل کرنے کی کوشش میں چین اپنے آپ میں ڈوب گیا۔ یہ تصادم بڑا عجیب تھا کہ یورپ زرہ میں ڈوبا ہوا تھا، اور چین اپنے آپ میں۔ یورپ کے لئے یہ تجربہ ایسا حیران کن تھا کہ وہ آج تک اس کے تقاضے نہیں سمجھ سکا۔ وہ سمجھ سکا تو بس یہی کہ اگر وہ پہلے دوشش تا کمر زرہ میں ڈوبا ہوا تھا تو چین کا مقابلہ کرنے کے لئے اسے سر تا پا زرہ میں ڈوب جانا چاہیئے۔ یہی امریکہ کی مشکل ہے اور یہی عالمی سیاست تو کیا عالمِ انسانی کی لعنت ہے۔ امریکہ یعنی یورپ تہذیبی اقدار کو سمجھنے کے قابل ہو جائے اور اس کی نظر مشین سے ہٹ کر انسان تک آپہنچے تو یہ لعنت آج دور ہو سکتی ہے۔ لیکن یورپ سے اس قلبِ ماہیت کی توقع عبث ہے۔ وہ اب تاریخِ انسانی کے اس باب کو قلم زد نہیں کر سکتا جس کو عنوان اس نے "عہدِ یورپ" کا دیا اور جس کا مضمون غارت گری اور آدم کشی سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ یہ کام مشیت کر رہی ہے اور کر کے رہے گی۔

چین میں یورپی اثر و دخل کے خلاف رد عمل پچھلی صدی کے عین آخر میں پیدا ہوا۔ اور جلدی ہی اصلیت

چین کی تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ تحریک جس طرح ابھری اور اس نے جو نتائج پیدا کئے، اس کا جائزہ "چین کے عالمی کردار" کے مطالعہ کے سلسلے میں لیا جا چکا ہے۔ چین بالعموم یورپی تسلّط سے محفوظ رہا اور چینی تہذیب طلسمِ فرنگ سے آزاد رہی۔ اس لئے وہاں یورپ کے خلاف ردِّ عمل پیدا ہونے اور اپنے آپ میں آنے کی سرگرم تحریک ابھرنے کے امکانات مقابلۃً زیادہ تھے۔ لیکن یورپ کے شکنجے سے نکلنے کی اور اپنی نشاۃِ ثانیہ کی جو تحریک عالمِ اسلامی میں پیدا ہوئی وہ یورپ کی توقعات کے برعکس اور اس کی کوششوں کے علی الرغم ہوئی یورپ پوری طرح عالمِ اسلامی پر مسلّط ہو گیا تھا۔ اور اس نے داستانِ اسلام کو قصۂ پارینہ بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ جیسا کہ "یورپ کے عالمی کردار" میں بیان کیا جا چکا ہے، یورپ نے سیاسی استیلا کو محض استحصال ہی کے لئے استعمال نہیں کیا، اس نے مسلمانوں کے تشخص کو مٹانے کے لئے بھی ایسی ایسی کوششیں کیں جو ظالم سے ظالم اور جابر سے جابر اقوام نے اپنے غلبے کے دوران نہیں کیں تھیں۔ فرعون بنی اسرائیل کے بچوں کے جسمانی قتل ہی کا مرتکب ہوا تھا، لیکن یورپ نے مغلوب اقوامِ مسلمہ کی نفیٔ ذات کو اپنی حکمتِ عملی کا نقطۂ ماسکہ بنا لیا۔ اس کی انتہائی کوشش رہی کہ عالمِ اسلامی بجائے خود دوسرا اور بدتر سپانیہ بن جائے۔ ایسا ہوتا چلا جا رہا تھا کہ ـــــ یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت! ـــــ اس حرکت کے آثار بھی پچھلی صدی کے آخر ہی میں دکھائی دینے لگے۔ عملِ احیاء جاری تو ایک عرصے سے تھا، لیکن جو عوامل نظروں سے اوجھل اور زیرِ سطح مصروفِ کار تھے، وہ پچھلی صدی کے اواخر اور اس صدی کے اوائل میں ہر دیدۂ بینا کو دکھائی دینے لگے۔ عالمِ اسلامی کے احیاء کا یہ مرحلہ بڑا جاں گسل تھا۔ اور یورپ نے اپنی تمام تر قوت مجتمع کر کے اور طرح طرح کے حیلوں اور حربوں کو بروئے کار لا کے اس کے نتائج کو واژگوں نہیں تو معطل ضرور کئے رکھا۔

ہمارے برصغیر میں ہندوؤں سے ملی بھگت کر کے انگریز نے تقسیمِ بنگال کی طے شدہ حقیقت کو کالعدم قرار دے کر مسلمانوں پر ایک بار پھر واضح کر دیا کہ وہ فرنگ سے امیدِ غمگساری نہ رکھیں اور اپنی اجل کو یقینی جان کر اپنے انجام کے لئے تیار رہیں۔ تقسیمِ بنگال کی تنسیخ کے بعد جنگِ طرابلس، جنگِ بلقان اور جنگِ عظیم کے ایسے طوفان در طوفان آئے جو مسلمانوں کے مرکز خلافت تک کو بہا کر لے گئے۔ اس دور کی یورپی سیاست اسی ایک نقطہ پر مرکوز ہو گئی تھی کہ کس طرح عالمِ اسلامی کی کلی بیخ کنی کر کے یورپ کے دعوائے انا ولا غیری پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی جائے۔ مسلمانوں کو ترکوں کے خلاف صف آرا کر کے یورپ نے خلافتِ اسلامیہ کے بالائے قومی تصور کو عملاً ختم کیا اور نہ صرف عثمانی خلافت کے حصے بخرے کئے، بلکہ ترکیہ کو مغلوب کر کے اس پر مسلط ہو گیا۔ یوں لگتا تھا کہ مسلمانوں کی حیاتِ قومی کے آخری باب کا آخری صفحہ بھی وقت کے بے رحم ہاتھوں نے الٹ دیا ہے۔ ستارے تو کیا، چاند تک ماند پڑ گیا تھا۔ ایک رات میں ہزاروں مہینوں کی راتوں کی تاریکی سمٹ آئی تھی ـــــ یہ فردوسانے کے لئے

کہ یہ تیاری مطلع الفجر کی ہے اس سینۂ شب تار سے ایقان کی یہ کرن پھوٹی — کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا — ان تاروں نے ڈوب ڈوب کر ایک آفتابِ تازہ کی پیدائش کا راستہ ہموار کیا ہے۔ بیسویں صدی کے ربع اول میں یورپ اور مشیت کے مابین بڑا خونریز معرکہ لڑا گیا۔ ایک طرف فطرت کے وہ لشکر تھے، جنہیں زمانے کی آنکھ دیکھ نہیں سکتی تھی اور دوسری طرف یورپ کی وہ مشینیں تھیں، جنہیں ابلیس غرور و تکبر سے سمیٹ سمیٹ کر محاذ پر لے آیا تھا۔

یورپ تو یہ معرکہ سر نہ کر سکا، لیکن میدان پوری طرح فطرت کے ہاتھ میں بھی نہ رہا۔ فطرت انسانی دنیا میں انسانی تعاون کے بغیر بظاہر بے بس سی ہوتی ہے۔ بے بس اس لئے کہ اس کے پیمانے انسانی ہاتھ کے بغیر گردش میں آتے ہیں تو محفل کو رنگ بدلتے ہزار ہزار سال لگ جاتے ہیں۔ حیاتِ انسانی کے کسی بحرانی دور میں بھی فطرت نے اپنے پیمانے چھلکانے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ اور کسی انجمن کو پیاسا نہیں رہنے دیا — یوں نہ ہوتا تو آج انسانی دنیا میں فساد ہی فساد کی بادشاہی ہوتی — لیکن زمانہ گواہ ہے کہ انسان نے ابھی تک اس ساقی کو نہیں پہچانا۔ اور یورپ دو سو سال سے انسان کو یہ سبز باغ دکھاتا چلا آرہا ہے کہ وہ جس نشاط کی تلاش میں ہبوطِ آدم سے سرگرداں چلا آرہا ہے وہ فرنگ کی مے کا براہِ راست نتیجہ ہے۔ اس کشمکش سے معرکے طول پکڑ گئے یورپ کے ایسا پر معرضِ وجود میں آنے والی عربی ریاستیں قبائلی عصبیت کا شکار دکھائی دینے لگیں۔ اور ترک یورپ کو شکست دے دینے کے باوجود غبارِ رہِ افرنگ بنتے نظر آئے۔

اس صدی کے پہلے پچیس سالوں میں فطرت نے وہ بنیادی اینٹیں تو چن دیں، جن پر مستقبل کی عمارت تعمیر ہونا تھی۔ لیکن گرد و پیش میں اس ملبے کے ڈھیر جا بجا موجود تھے جو ہر غیر یورپی کوششِ تعمیر پر تخریب کا ملمع کر کے اس کا ابتدا میں ہی قلع قمع کر دیتے۔ عربوں اور ترکوں کی کشمکش اور دونوں کا سوئے مغرب دیکھنا اسی ایک نکتہ کی تفسیریں ہیں۔ اس صورتِ حال سے یورپ کا مجرم تو پوری طرح نہ کھلا، لیکن سیاسی آزادی کی جد و جہد کو فروغ ہونے لگا۔ سیاسی آزادی کی تڑپ نے لامحالہ وطنیت کا تصور ابھارا۔ اور اس طرح رفتہ رفتہ عالمگیر اسلامی برادری اقوام و ممالک میں تقسیم ہونے لگی۔ یہ تقسیم بالعموم ان خطوطِ سیاسی کے مطابق ہونے لگی جو یورپ کی استعماریت نے جگہ جگہ کھینچ دیئے تھے۔ وطنیت کے جذبات نے اخوتِ اسلامیہ کو جس طرح متاثر کیا سو کیا۔ اس سے یورپ سے گلو خلاصی حاصل کرنے کا جذبہ تقویت پا کے باقاعدہ قومی تحریکوں کی شکل اختیار کر گیا۔ ملکوں ملکوں میں قومی تحریکوں کے فروغ نے ایک مشترکہ دشمن اور مقصد کی بنا پر سیاسی ہمدردی کی رو پیدا کی۔ چنانچہ یورپی اثر کے تحت اخوت کی جو رو اچاٹ ہو گئی تھی۔ وہ یورپ کے خلاف سیاسی جد و جہد کی بدولت ملنے لگی۔ فطرت کی سوزن کاری کو دیکھتے ہوئے حتم و یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ دستِ یورپ نے جن گریبانوں کو چاک کیا ہے۔

وہ رفو ہوتے جارہے ہیں اور بالآخر رفو ہو کے رہیں گے۔

بیسویں صدی کا نصف اول ہمہ گیر رستاخیز کا دور تھا۔ یورپ نے بڑی کوشش کی کہ اس کی غارت گری اور آدم کشی نے جو طوفانِ بدتمیزی برپا کر دیا ہے، اس کا واویلا نیچے سُروں میں رہے لیکن یورپ کے زخم خوردگی چیرہ دستی اس واویلے کو دبانے میں یکسر ناکام رہی اور دیکھتے دیکھتے دنیا دو جنگوں کے جہنم کی نذر ہو گئی۔ یہ جنگیں دو مختلف حادثات نہ تھیں بلکہ یورپ کے دھکائے ہوئے جہنم کے دو بھڑکتے، لپکتے شعلے تھیں۔ ان شعلوں نے یورپ کی بنیادوں کی بوسیدگی عالم آشکار کر دی تو یورپ نے دجل و فریب سے کام لے کر اس پر پردہ ڈالنا شروع کر دیا۔ پہلے اس نے جمعیتِ اقوام کا، پھر اقوامِ متحدہ کا شعبدہ کھڑا کیا۔ اور اب وہ فضلئے بسیط کو چیر کر چاند تک پہنچنے میں لگا ہوا ہے۔ یہ اس کے اندازِ گفتگو اور طرزِ کردار کے دھوکے ہیں یہ جتانے کے لئے کہ وہ انسانی سربلندی اور اقدار و اخلاق کا علمبردار ہے۔ ایسا وہ نہ کبھی تھا، نہ ہے، نہ ہو سکتا ہے۔ اس کی فریب کاری کا پردہ اس صدی میں آ کے چاک ہوا ہے۔ چین اور اسلامی دنیا میں سحرِ فرنگیانہ کے ٹوٹنے کی ایسی طرح پڑی کہ ــــ بات چل نکلی ہے دیکھیں کہ کہاں تک پہنچے ــــ اس صدی کے اوائل میں قدسیوں سے ہم کلام ہونے والا کوئی اقبالؔ ہی اس شیر کے ہوشیار ہونے کا تصور کر سکتا تھا جس نے صحراسے نکل کر روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا۔ بیسویں صدی کے آخر تک دل کے ہنگامے جتنے مغرب نے اس بے دردی سے خاموش کر دیئے تھے کہ کسی اقبالؔ ہی کی آنکھ خمستانِ حجاز کے رندوں کو ہوش میں آتا دیکھ سکتی تھی۔ اور اسی دل گردے کا فرد انیسویں صدی کی شامِ غم میں بیسویں صدی کی اس صبحِ عید کی خبر پا سکتا تھا جس کا نظارہ کرنے کی سعادت ہمیں میسر آنے لگی ہے، ورنہ اس ظلمتِ شب سے گزرنے والوں کو امید کی کرن کا خفیف سا دھوکہ بھی نہیں ہوا تھا۔ ــــ آج نگہِ بازگشت ڈال کے دیکھا جائے تو صاف دکھائی دے گا کہ ان ایام میں فطرت ہمارے سامنے اور ہمارے درمیان بہت بڑا تجربہ کر رہی تھی۔ اس تجربے کے مضمرات کو اقبالؔ بھانپ رہا تھا۔ لیکن جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا اسے وہ لب پر نہیں لا سکتا تھا، پردے آج بھی پوری طرح نہیں اٹھے۔ لیکن ہم ظلمتِ شب گذار کے صبحِ کاذب کی منزل سے آگے نکل آئے ہیں۔ اب کوئی دم جاتا ہے کہ ــــ

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش!

ــــ اور ــــ

پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائیگی!

ــــ چین کے عالمی کردار کا جائزہ لیتے ہوئے اس پہلو پر قدرے مکمل کے بات کی جا چکی ہے!

یورپ کی بھڑکائی ہوئی دونوں جنگوں کے بطن سے آزاد و خودمختار ممالک پیدا ہو کر عالمی نقشے

پر اُبھرے۔ پہلی جنگ کے بعد ایشیا بیدار ہوا تھا تو دوسری جنگ کے بعد آزادی کے تیز دھارے نے افریقہ کا رُخ کیا۔ اب دونوں براعظم تقریباً آزاد ہو چکے ہیں۔ ان براعظموں کی سیاسی آزادی یورپ کے چنگل سے آزاد ہونے کی صرف تمہید ثابت ہوئی۔ کیونکہ سیاسی آزادی کے سبز باغ میں لاکر یورپ نے معاشی غلامی کا ہم رنگِ زمین دام چار سو پھیلا دیا۔ ایک طرف یہ ڈھنڈورا پیٹا گیا کہ یورپ نے محض انسانی ہمدردی میں ان ممالک کو آزاد کیا ہے ورنہ وہ اس قدر پسماندہ ہیں کہ اپنے معاملات تک نپٹانے پر قادر نہیں اور دوسری طرف انہیں باور کرایا گیا کہ وہ یورپ کی انگلی پکڑے بغیر نہ کھڑی ہو سکتی ہیں اور نہ دو قدم چل سکیں گی۔ سیاسی آزادی کو معاشی فریب میں لاکر یوں اسے غیر مؤثر بنانے کی کوشش بڑی ڈھٹائی سے جاری رہی۔ لیکن چند سالوں سے یہ بھرم بھی کھل گیا ہے۔ اب یورپ کا اثر زائل ہونے اور اس کی پسپائی کے واضح تر آثار پیدا ہونے لگے ہیں چین کو اپنے آپ میں آتا دیکھ کر امریکہ تو پہلے ہی آپے سے باہر ہو گیا تھا۔ لیکن روس نے ۷۰ء تک اس کا ساتھ دیا اور بالآخر وہ بھی دستکش ہو بیٹھا۔ چین پہلے ہی اپنی راہ خود تراش رہا تھا۔ امریکہ کی دشمنی اور روس کے مقاطعہ نے اسے تاریخ کے روبرو لا کھڑا کیا۔ اور آئینۂ ایام نے اس کے صحیح خدوخال اسے دکھا دیئے۔ اس طرح محض ضد میں آکر یورپ نے چین کے بے منتِ یورپ ابھرنے کا راستہ ہموار کر دیا۔ یہ یورپ کی بہت بڑی پسپائی ہے۔ لیکن وہ اس ضیفتِ کبریٰ کا منہ چڑانے پر مصر ہے۔

جو امتیاز چین کو حاصل ہوا وہ عالمِ اسلامی کو حاصل ہونے لگا ہے۔ اسرائیل کا تخمِ خبیث عربوں کی زمین میں بو کر یورپ نے اس میں کوئی شبہ نہیں رہنے دیا کہ وہ عالمِ عرب کو اپنے طفیلی اور ریزہ چیں سے زیادہ حیثیت دینے کے لئے تیار نہیں۔ اس سے قدرتی طور پر عربوں کی نگاہیں مشرق، دور مشرق کی طرف مڑنے لگیں۔ گو بعض عرب ابھی یہ سمجھ نہیں سکے کہ مشرق کا بھارت، مغرب کی فوجی چوکی ہے اور اس سے اس لئے حذر لازم ہے کہ اس سرنگ کا دوسرا منہ امریکہ میں جا کر کھلتا ہے تاہم وہ یورپ کے چنگل سے آزاد ہوتے دکھائی دیتے ہیں ایسا ہی تجربہ پاکستان کو ہو رہا ہے۔ امریکہ اس سے خودکشی کا تقاضا کر رہا ہے اور بھارتی رتھ سے باندھ کر سوتے چین سے لے جانا چاہتا ہے تاکہ فطرت جدید انسانیت سے تہذیبِ یورپ کا زہر صاف کرنے کے لئے جو تجربہ نصف صدی سے کرتی چلی آ رہی ہے اسے ناکام بنا دیا جائے۔ چین اور پاکستان وہ نشتر ہیں جن سے فطرت یورپ کی فصد کھول رہی ہے۔ دستِ فطرت تیز تیز چلنے لگا ہے۔ اور آج ایشیا اور افریقہ میں جو خون بہہ رہا ہے وہ اسی نشتر کی نوک کا مرہونِ منت ہے۔ یہ خون بہتا جائے گا اور انسانیت کے عروقِ مردہ میں تازہ زندگی رواں دواں ہوتی چلی جائے گی۔ یورپ اپنی موت اور انسانیت کی نشاۃ کو اب روک نہیں سکتا۔ لیکن یہ معرکہ جتنا فیصلہ کن ہوگا اتنا ہی خوں ریز بھی ہوگا ——— اور طویل بھی ؟

طلوعِ اسلام کی کتابیں — اور — ماہنامہ طلوعِ اسلام

یہاں سے بھی مل سکتے ہیں!

لاہور: (۱) انٹرنیشنل بک سروس .. ۵ دی مال لاہور
(۲) کلاسیک بکسیلرز .. .. ۴۲ دی مال "
(۳) پیپلز پبلشنگ ہاؤس .. ۲۶ دی مال "
(۴) کواپریٹو بک شاپ .. .. ۷۰ دی مال "
(۵) لاہور بک ڈپو .. .. ۶۵ دی مال "
(۶) بک سنٹر .. .. چوک رنگ محل دی مال "
(۷) ادبستان .. .. چوک لکشمی لاہور
(۸) آئیڈیل بک ہاؤس .. ۱۹۳ انارکلی "
(۹) مکتبۂ پاکستان .. .. چوک انارکلی "
(۱۰) گوشۂ ادب .. .. چوک انارکلی "
(۱۱) اسمٰعیل اینڈ برادرز .. چوک انارکلی "
(۱۲) نیشنل بک سٹال .. چوک انارکلی "
(۱۳) ماڈل بک سٹال .. فورٹس مارکیٹ دی مال "
(۱۴) ادریگا بک سٹال .. گلبرگ نمبر ۲ ۔ لاہور
(۱۵) پیپلز پبلشنگ ہاؤس
المنار مارکیٹ ۔ چوک انارکلی ۔ لاہور

لائلپور: (۱) محمد احمد صاحب متعلم ایم ۔ اے ۔ گلی نمبر ۳
بلاک نمبر ۱ ۔ نزد پرانی غلہ منڈی ۔ ریل بازار
(۲) شریف سنز بکسیلرز ۔ کارخانہ بازار ۔ لائلپور
(۳) حافظ محمد یونس صاحب ۔ اے ۶۷ ۔ گلبرگ ۔ لائلپور

کراچی: (۱) محترم محمد اسلام صاحب (۴/۱۰۲) لوئیس روڈ ۔
نیو ٹاؤن ۔ کراچی نمبر ۵ ۔ فون (۲۳۵۸۸۰)
(۲) ہر اتوار کی صبح ۔ ۹ بجے تا ۱۲ بجے
سندھ اسمبلی ہال ۔ بندر روڈ ۔
(۳) گلڈز انجمن کتاب گھر ۔ وکٹوریہ روڈ ۔ صدر ۔
(۴) عوامی کتب خانہ ۔ بولٹن مارکیٹ ۔
(۵) شیخ شوکت علی اینڈ سنز ۔ بندر روڈ ۔ کراچی ۔
(۶) جنرل بک ڈپو ۔ فریئر روڈ ۔
نزد حبیب بینک کراچی ۔
(۷) اقبال کتاب گھر ۔ سمرسٹ اسٹریٹ
کراچی صدر ۔

لیہ: قفل ہوٹل ۔ نزد ریلوے اسٹیشن
ہر جمعہ کو ۔ بعد نماز عصر ۔

انگلستان: محترم رشید احمد بٹ صاحب ۔
۱۶۰ ۔ سالٹ سٹریٹ ۔ بریڈ فورڈ نمبر ۸

سرگودہا: حکیم حسن محمد نظامی ۔ نظامی دواخانہ
بلاک نمبر ۱۷ ۔ گلی مچھلی والی ۔ سرگودہا ۔

میانوالی: صوفی عبدالرحمن صاحب جلد ساز ۔
چوک فتح خان ۔ ملک مظفر اسٹریٹ ۔ میانوالی ۔

ملتان: دانشکدہ حسین آگاہی ۔

مردان: (۱) صادق کمیشن ایجنسی ۔ بکٹ گنج ۔ (۲) صدیقیہ انجینئرنگ ورکس ۔ بینک روڈ ۔

بیادِ اقبالؒ

ایک شعر

سُلطانی و مُلائی و پیری

۲۳ اپریل ۱۹۶۷ء کی شام، وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال لاہور میں

بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کے زیرِ اہتمام

یومِ اقبالؒ کی تقریب پر

پرویز صاحب کا برجستہ خطاب

جس نے سامعین پر وجد کی سی کیفیت طاری کر دی!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اے کُشتۂ سُلطانی و مُلّائی و پیری

صدرِ محترم، میری عزیز بہنو اور بھائیو!

آپ نوعِ انسان کی تاریخ پر غور کیجئے۔ جس زمانہ میں، جس ملک میں، اور جس قوم میں آپ کو فسادِ آدمیت کی جھلک نظر آئے گی، تحقیق کے بعد معلوم ہوگا کہ اس فساد انگیزی کے عوامل و عناصر تین ہی ہوں گے — یعنے ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری — زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ یہ ابابیس دہر اپنا پیکر بدلتے رہیں گے۔ لیکن روح ہر زمان اور ہر مکان کی یہی کارفرما ہوگی۔ اگر آپ قرآنِ کریم پر بہ نگاہِ تعمق غور کریں گے تو یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجائے گی کہ حضرات انبیائے کرامؑ کی دعوت، انہی فساد انگیز عناصر کے خلاف، نعرۂ انقلاب تھی۔ وہ انسانوں کو نظامِ خداوندی کے مرکز پر جمع کرتے تاکہ ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری کے تختوں کو اُلٹ دیا جائے۔ انبیائے گذشتہ کے کوائف اور امم سابقہ کی داستانیں جو قرآن میں مذکور ہیں، وہ اسی کشمکش کی سرگذشت اور اسی انقلابی جدوجہد کی تفاصیل ہیں۔ ان داستانوں میں، قصہ بنی اسرائیل کو خاص اہمیت حاصل ہے، اس لئے کہ اس کشمکش میں، فسادِ آدمیت کے یہ تینوں گوشے یکجا سامنے آ گئے تھے۔ یعنی فرعونؔ، استبدادِ ملوکیت کا مجسمہ۔ ہامانؔ، مذہبی پیشوائیت کی ابلیسانہ روباہ بازیوں کا پیکر، اور قارونؔ سرمایہ داری کی خون آشامیوں کا نمائندہ — یہ تینوں یکجا، اور ان کے پنجۂ فولادی کی گرفت میں تڑپتی، پھڑکتی قوم بنی اسرائیل جس کی رستگاری کے لئے ایک جوڑا، دو دو اولوالعزم پیغمبر (صاحبِ ضربِ کلیم، حضرت موسےٰؑ اور ان کے بھائی حضرت ہارونؑ) مصروفِ جہاد — اور اگر تاریخ کا بیان صحیح ہے تو وادیٔ سینا میں ایک اور پیغمبر حضرت شعیبؑ ان کے مددگار

یہ کشمکشِ حق و باطل، یہ چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی کی ستیزہ کاری، اسی طرح مسلسل چلی آ رہی تھی کہ آج سے چودہ سو سال پہلے، خدا کی آخری کتاب — قرآن کریم — اور اس کا آخری رسول — نبی اکرمؐ — نوعِ انسان کو ان فساد انگیزیوں سے نجات دلانے کے لئے آئے۔

انقلابِ عظیم

قرآن کریم نے حضور نبی اکرمؐ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا ہے کہ وَ یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ ۔ (۷/۱۵۷)۔ وہ ان زنجیروں کو توڑ دے گا جن میں انسانیت جکڑی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ اور ان بوجھل سلوں کو اس کے سر سے اتار دے گا۔ جن کے نیچے وہ کچلی جا رہی تھی — نبی اکرمؐ نے اپنی عدیم المثال انقلابی جدوجہد سے، ملوکیت، مذہبی پیشوائیت، اور نظامِ سرمایہ داری کی ان زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا۔ اور اس طرح خدا کی مخلوق دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہو گئی۔

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست
نقشِ ہائے کاہن و پاپا شکست

لیکن یہ دورِ حریت و آزادی تھوڑے عرصہ تک قائم رہا اور اس کے بعد خود مسلمانوں نے ان زنجیروں کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو اپنی "مژگانِ عقیدت" سے ایک ایک کر کے چنا اور اس طرح اپنے گلے میں ڈال لیا کہ پھر کوئی قوت انہیں توڑ نہ سکے۔ میں اس وقت اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ ایسا کس طرح ہوا۔ (اس کی وضاحت میں اس سے پہلے متعدد مقامات پر کر چکا ہوں) اس وقت میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ آسمان کی آنکھ نے اس سے زیادہ حیرت انگیز تماشا کہیں نہیں دیکھا ہوگا کہ

حیرت انگیز رجعت

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست
خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

جب ہم اپنی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو محوِ حیرت رہ جاتے ہیں کہ مسلمان اس غیر قرآنی زندگی کا اس قدر خوگر ہو چکا ہے کہ اس کے نزدیک نفسِ حلال اور آشیانہ "حرام" ہے۔ اس کے اسباب و علل ظاہر ہیں۔ مفاد پرست گروہ نے اقتدار کی کرسیوں اور رزق کے سرچشموں پر قبضہ کر لیا۔ مذہبی پیشوائیت نے اس خلافِ اسلام نظام کو عین اسلام ثابت کرنے میں "شرعی سندات" مہیا کر دیں — اربابِ حکومت ان کے وظیفے مقرر کر دیتے تھے اور یہ منبروں پر کھڑے ہو کر، انہیں "ظل اللہ علی الارض" قرار دیتے اور ان کی سلامتی کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ یہ وہی فرعون، ہامان اور قارون کی ملی بھگت تھی جسے

قرآن نے داستانِ بنی اسرائیل کے سلسلہ میں اس شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ گمان غالب ہے کہ اس دوران میں خدا کے ایسے بندے بھی پیدا ہوتے ہوں گے، جنہوں نے اس کے خلاف آواز اُٹھائی ہو۔ لیکن جیسا کہ ہر مستبد نظام کیا کرتا ہے، ان کا گلا گھونٹ دیا گیا اور ان کے آثار تک کو مٹا دیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ آج ہمارے ہاں ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی تاریخ تو پوری تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن اس کے خلاف آواز اٹھانے والوں کا ذکر تک کہیں نہیں ملتا، بجز اس کے کہ اس تاریخ میں کہیں طعن و تشنیع کے ساتھ انہیں ہدفِ ملامت بنا دیا گیا ہو۔ اس سارے طوفانِ بلا میں اگر امید کا کوئی سہارا ہے تو وہ یہ کہ خدا کی کتاب کے الفاظ ہمارے ہاں محفوظ چلے آتے ہیں۔

یہی تھی خدا کی وہ کتابِ محفوظ جس پر ہمارے دور کے ایک عظیم مفکر نے عمر بھر غور و فکر کیا اور اس کے بعد اس حقیقت کو واشگاف الفاظ میں امت کے سامنے پیش کیا کہ اس کی یہ حالت اس لئے ہوئی ہے کہ ؎

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر ؛ سود خوار و والی و مُلّا و پیر

اور اس نے مسلمان کو مخاطب کر کے کہا کہ ؎

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

میں آج کی نشست میں، مختصر الفاظ میں اس حقیقت کو آپ کے سامنے لانے کی کوشش کروں گا، کہ قرآن کریم نے فسادِ آدمیت کے ان تینوں گوشوں ـــــ ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری ـــ کے متعلق کیا کہا ہے اور اقبال نے اپنے حسین و بلیغ انداز میں اس کی کس طرح تشریح کی ہے۔

ملوکیت

ہمارے ہاں 'ملوکیت' سے مراد موروثی بادشاہت لی جاتی ہے۔ یعنی باپ کے بعد بیٹے کا تخت نشین ہونا۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں جہاں یہ آیا ہے کہ (حضرت) معاویہؓ نے اپنے بیٹے کو اپنا ولیعہد مقرر کر دیا تو کہا جاتا ہے کہ اس سے ملوکیت کا آغاز ہوا۔ دنیا کے عام تصور کے مطابق بھی، ایک فرد کی حکومت کو پہلے ملوکیت (MONARCHY) یا شخصی اقتدار (AUTOCRACY) کہا جاتا تھا اور اب اسے آمریت (DICTATORSHIP) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی عام تصور کے مطابق، اگر کسی

ملک پر اُس ملک کے رہنے والوں کی حکومت ہے تو اسے آزادی کہا جاتا ہے اور اگر اس پر کسی دوسرے ملک کی قوم حکمران ہے تو اُسے محکومی کہا جاتا ہے۔ آزادی اور محکومی کا یہ تصور تو دنیا میں اب تک موجود ہے لیکن انقلابِ فرانس نے، ایک جدید سیاسی نظام کو جنم دیا جسے جمہوریت یا ڈیماکریسی کہہ کر پکارا گیا۔ لفظی طور پر تو اس سے مفہوم ہے پوری کی پوری قوم کی حکومت، لیکن عملاً اس سے مراد ہے نمائندگانِ قوم میں سے اس پارٹی کی حکومت جسے اکثریت حاصل ہو۔ یعنی اس میں اقتدارِ مملکت، ایک فرد کے بجائے ایک گروہ کو حاصل ہوتا ہے۔ میں اس وقت اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ دو سو سال کے تجربہ نے اس جمہوریت کے متعلق خود یورپ کے اربابِ فکر و نظر اور اصحابِ سیاست و عمرانیت کو کس نتیجے پر پہنچایا ہے اور وہ کس طرح اس کے ہاتھوں تنگ آ چکے ہیں۔ میں اس وقت اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا۔ کہ مغربی جمہوریت کی مشینری ایسی ہے جس کی رُو سے وہی لوگ قوم کے نمائندوں کی حیثیت سے منتخب ہو سکتے ہیں جنہوں نے کسی نہ کسی طرح، دولت سمیٹ کر معاشرہ میں اثر و رسوخ حاصل کر لیا ہو۔ لہٰذا، اس طرزِ حکومت سے جس گروہ کے ہاتھ میں زمامِ اقتدار آتی ہے وہ صلاحیت و قابلیت یا سیرت و کردار کی رُو سے قوم کا منتخب طبقہ نہیں ہوتا۔ مفاد پرستوں ہی کا ایک گروہ ہوتا ہے۔ لہٰذا، ملوکیت و آمریت اور جمہوریت میں فرق اتنا ہی ہوتا ہے کہ ملوکیت میں بزنس (کاروبار) ایک فرد کی ملکیت ہوتا ہے۔ جمہوریت میں یہ ایک لمیٹڈ کمپنی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ مقصد دونوں کا سلب و نہب (EXPLOITATION) ہوتا ہے۔

قرآن کریم نے انسانی آزادی اور محکومی کا بنیادی تصور ہی بدل دیا۔ اس نے کہا کہ انسانوں پر حکومت کا حق کسی کو حاصل ہی نہیں۔ نہ ایک فرد کو، اور نہ افراد کی کسی جماعت کو — مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ (۳/۷۹) — کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں — خواہ اسے ضابطۂ قوانین اور اقتدارِ امور حتیٰ کہ نبوت تک بھی کیوں نہ مل چکی ہو، کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں بلکہ میرے محکوم و فرمانبردار بن جاؤ۔ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے — اِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ۔ (۱۲/۴۰) اور اس کی عملی شکل یہ ہے کہ کاروبارِ مملکت، خدا کی نازل کردہ کتاب کے مطابق سرانجام پائے۔ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ۔ (۵/۴۴) جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق نظامِ مملکت قائم نہیں کرتے، تو انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔ (۵/۴۵) یہ لوگ ظالم ہیں — انسانوں کو حاکم اور محکوم کے طبقات میں تقسیم کر دینے سے بڑا ظلم اور کیا ہو سکتا ہے! لہٰذا، قرآن کی رُو سے مملکت، قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنے کی ایجنسی ہے اور یہ فریضہ

امت کے باہمی مشورہ سے سرانجام پاتا ہے۔ کہ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) خلیفہ کا ارشاد ہے۔ اس تصور کی رُو سے، ایک ملک پر اگر خود اس ملک کے رہنے والے حکمران ہوں، اور حکومت کا انداز مغربی جمہوریت بھی ہو، لیکن کاروبارِ مملکت خدا کی کتاب کے مطابق سرانجام نہ پا رہا ہو تو وہ آزادی نہیں غلامی ہے اسے ملوکیت کہا جائے گا۔ لیکن اگر نظامِ مملکت، قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل ہو اور امورِ مملکت امت کے باہمی مشورے سے طے پائیں، تو یہ آزادی ہے۔ خواہ طرزِ حکومت (FORM OF GOVERNMENT) کسی قسم کا ہو۔ اسے ہماری اصطلاح میں "خلافت" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں تصوراتِ حکومت، (ملوکیت اور خلافت) ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک اسلامی ہے اور دوسرا غیر اسلامی۔ یہ جو آجکل کہا جاتا ہے کہ صدارتی نظامِ جمہوریت غیر اسلامی ہے اور پارلیمانی سسٹم مطابق اسلام، تو یہ محض سیاسی نعرہ بازی ہے۔ اسلامی نظامِ جمہوریت اس کے سوا کچھ نہیں کہ قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے، قوم کے مشورہ سے کاروبارِ مملکت سرانجام پائے۔

صدیوں کی ملوکیت کے خواب آور اثرات سے مسلمان، خلافت کے تصور کو فراموش کر چکا تھا۔ دوسری طرف، یورپ نے نظامِ جمہوریت کے حق میں اس قدر پراپیگنڈہ کیا کہ ساری دنیا اس سے مسحور ہو گئی۔ اور یہ سمجھنے لگی کہ جنت سے نکلے ہوئے آدم نے پھر سے فردوسِ گم گشتہ کو پا لیا ہے۔ وہ اس نظام کو آیۂ رحمت اور نوعِ انسانی کے لئے سحابِ کرم خیال کرتی تھی — ان کی دیکھا دیکھی، خود مسلمان بھی اسے انعامِ خداوندی سمجھنے لگا۔ اور یہ آوازیں چاروں طرف سے اٹھنی شروع ہو گئیں کہ نظامِ جمہوریت عین مطابق اسلام ہے۔ اس ہنگامۂ ہائے وہو، اور تلاطم شور و شغب میں، جبکہ ساری فضا اسی قسم کے نعروں سے گونج رہی تھی، اقبال کی فراستِ قرآنی نے اس فتنہ کو بھانپا اور اپنی بھرپور آواز سے مسلمانوں کو للکار کر کہا کہ اس فریب میں مت آؤ۔ ؎

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری!

اس نے کہا کہ یاد رکھو! نظامِ حکومت جمہوری ہو یا شخصی، اگر اس کی اساس خدا کی کتاب پر نہیں تو وہ ملوکیت ہے۔ اس کے برعکس، جس نظام کی بنیاد، ضابطہ قوانینِ خداوندی پر ہے وہ عین اسلام ہے۔ اسے خلافت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور ؎

خلافت بر مقامِ ما گواہی است — حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ — خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است

اس لئے ہر وہ نظام جس میں غیر قرآنی قوانین رائج ہوں، ملوکیت ہے اور ظلم و استبداد کا مظہر!

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اقبال کی آخری کتاب "ارمغانِ حجاز" میں (جو اس کی وفات کے بعد شائع ہوئی تھی) ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے — ابلیس کی مجلسِ شوریٰ — میرے نزدیک وہ عصرِ حاضر کی تہذیب و تمدن اور سیاست و حکمت پر شدید ترین تنقید ہے اور فکرِ اقبال کا نچوڑ..... اس کے ساتھ ہی، اسلام کے ایک زندہ و متحرک نظامِ حیات بننے کے خلاف جو قوتیں نہایت غیر محسوس طور پر مصروفِ جنگ و تاز ہیں، اس میں ان کی نشاندہی اور نقاب کشائی بڑے شوخ اور حسین انداز سے کی گئی ہے۔ نظم کا پلاٹ یہ ہے کہ ابلیس کی کابینہ (CABINET) کا اجلاس ہو رہا ہے جس کی صدارت خود ابلیس کر رہا ہے۔ اس کابینہ میں ان تمام عوامل کو ایک ایک کر کے سامنے لایا جا رہا ہے جو ابلیسی نظام کے ضعف کا باعث بن سکتے ہیں۔ یہ عوامل زیرِ بحث آتے ہیں اور متعلقہ مشیر (وزیر) یہ بتاتا ہے کہ اس نے اس کی مدافعت کے لئے کیا حربہ تجویز کیا ہے۔ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جمہوری نظام کی نمود اس حقیقت کی غماز ہے کہ انسان اس نظامِ ملوکیت سے تنگ آ چکا ہے جسے ابلیس نے مدت ہوئی وضع کیا تھا۔ اگر انسان نے اس نظامِ نو کو اختیار کر لیا تو پھر ابلیسی نظام کو زوال آ جائے گا۔ چنانچہ اس شیر نے وزیرِ سیاست سے دریافت کیا کہ ؎

خیر ہے سلطانیٔ جمہور کا غوغا کہ شر
تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر

وزیرِ امورِ سیاسیہ مسکرایا، اور کہا کہ "ہوں!" یعنی میں ان سب تازہ فتنوں سے باخبر ہوں ؎

ہوں مگر میری جہاں بینی بتاتی ہے مجھے ؛ جو ملوکیت کا اک پردہ ہو کیا اس سے خطر؟
ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس ؛ جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

بات یہ ہے کہ ؎

کاروبارِ شہریاری کی حقیقت اور ہے ؛ یہ وجودِ میر و سلطاں پر نہیں ہے منحصر
مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو ؛ ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر
تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام ؛ چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

زمانہ قدیم کی ملوکیت اور عصرِ حاضر کی جمہوریت اصل کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ دورِ جہالت کی شخصی ملوکیت جو کچھ کرتی تھی کھلے بندوں کرتی تھی۔ لیکن عصرِ حاضر کی "جمہوری ملوکیت" وہی کچھ تہذیب کی اوٹ میں اور مفادِ عامہ کے تحفظ کے نقاب میں کرتی ہے۔ اُس زمانے کی سلبِ نہب (EXPLOITATION) کو بادشاہ اپنا حق سمجھتا تھا۔ اِس زمانے کی "ملوکیت" اس سلب و نہب کو (PUBLIC INTEREST) کہہ کر عوام کو دھوکا دیتی ہے۔ یہ ہے وہ جمہوریت جس کا چہرہ روشن اندرون چنگیز سے تاریک تر ہے۔

یہ تھا وہ جواب، جو ابلیس کی مجلسِ شوریٰ میں وزیرِ امورِ سیاسیہ کی طرف سے دیا گیا۔ ابلیس کا یہ حربہ کس قدر کارگر ہے، اس کی تشریح اقبالؒ نے، بالِ جبریل کی ایک نظم میں کی ہے جس کا عنوان ہے — "ابلیس کی عرض داشت"۔ ابلیس خدا کے حضور ایک درخواست لے کر پہنچتا ہے جس میں تفصیل سے بتاتا ہے کہ اس دور میں، کارپردازانِ نظامِ مملکت، ان فرائض کو جو ابلیس کے سپرد کئے گئے تھے، کس حسن و خوبی سے سرانجام دے رہے ہیں۔ اس لئے اب اُس کی اس کرۂ ارض پر ضرورت باقی نہیں رہی۔ اسے کہیں اور "ٹرانسفر" کر دیا جائے۔ وہ بحضور رب العزت عرض کرتا ہے کہ ؎

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک!

میرے یہاں سے چلے جانے سے، اہرمنی سیاست کے کاروبار میں کسی قسم کا خلل واقع نہیں ہوگا بلکہ وہ اور زیادہ چمک اٹھے گا۔ اس لئے کہ ؎

تیری حریف ہے یا رب سیاستِ افرنگ
مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے!
بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

پھر میری تو یہ کیفیت ہے کہ ہر شخص میرا نام سننے پر (زبان ہی سے سہی) لاحول پڑھتا ہے لیکن ؎

شیاطینِ ملوکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جادو
کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری!

یوں اقبالؒ نے دورِ حاضر کی اس ملوکیت (یعنی مغربی نظامِ جمہوریت) کے خلاف مسلسل جہاد کیا۔

مذہبی پیشوائیت

اے برادرانِ عزیز! آگے بڑھیئے۔

آپ انسانی نفسیات پر غور کیجئے۔ دنیا میں کوئی انسان بھی کسی دوسرے انسان کا محکوم اور غلام بننا نہیں چاہتا۔ اس کی طبیعت ان زنجیروں کے خلاف اِبا کرتی ہے۔ پھر یہ کیا ہے کہ انسانوں کا گروہِ عظیم ایک انسان یا انسانوں کے گروہ کی محکومی اور غلامی پر اس طرح رضامند ہو جاتا ہے کہ اس کے خلاف بغاوت کرنا تو ایک طرف اس کے دل میں اس کے خلاف نفرت کا جذبہ تک پیدا نہیں ہوتا؟ یہ کام مذہبی پیشوائیت کرتی ہے۔ اس کی سحر آفرینی کا اثر ہے کہ ـــ صید خود صیاد را گوید بگیر! ـــ

برہمن عوام کو یہ کہہ کر افیون پلاتا ہے کہ راجہ ایشور کا اوتار ہے۔ کلیسا کا اُسقف' سادہ لوح انسانوں سے کہتا ہے کہ بادشاہ کو حقوقِ خداوندی (DIVINE RIGHTS) حاصل ہوتے ہیں۔ محراب و منبر سے یہ سحر آفریں الفاظ دہرائے جاتے ہیں کہ ـــ السُّلطانُ ظلُّ اللہ علی الارض ـــ بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہے۔ اس لئے بادشاہ کے حکم کی تعمیل درحقیقت اطاعتِ خداوندی ہے۔ جو اس سے سرتابی کرتا ہے، وہ خدا کی معصیت کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس قسم کے وعظ کہتا رہتا ہے کہ دنیا قابلِ نفرت شے ہے۔ اس سے دور بھاگو۔ اس دنیا کی قوت و دولت' ثروت و حشمت' زیب و زینت' فاسق و فاجر لوگوں کے لئے ہے۔ خدا کے بندوں کی دنیا آخرت ہے۔ انہیں اس پر نگاہ رکھنی چاہیئے۔ اور آخرت کے حصول کے لئے وہ چند بے روح عقاید اور بے جان رسومات کو عین دین قرار دے کر' لوگوں کو ان میں زیادہ سے زیادہ منہمک رکھتا ہے تاکہ اُن کی نگاہ دوسری طرف اٹھنے ہی نہ پائے۔

مذہبی پیشوائیت' عوام کو اس فریب میں مبتلا رکھتی ہے تاکہ ملوکیت کو اپنی سلطنت میں کسی قسم کا خطرہ نہ رہے۔ اس طرح ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا ساجھا ہو جاتا ہے۔ راجہ' برہمن کی رکھشا (حفاظت) کرتا ہے اور برہمن' راجہ کو اشیرباد (دعا) دیتا ہے۔ کنگ' کلیسائی نظام کے لئے جاگیریں مقرر کرتا ہے اور کلیسا' بادشاہ کے حقوقِ خداوندی کا محافظ بنتا ہے۔ سلطان' مذہبی پیشواؤں کے وظائف مقرر کرتا ہے اور مذہبی پیشوا برسرِ منبر اس کے لئے تائید و نصرت کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں۔ یہ ہے ملوکیت اور برہمنیت کی وہ ملی بھگت جس سے استبداد کے فولادی پنجہ کی گرفت کبھی ڈھیلی نہیں ہونے پاتی۔ یاد رکھیئے! ہامان کی مدد کے بغیر کسی فرعون کی فرعونیت ایک دن بھی نہیں چل سکتی۔ اسلام نے ملوکیت کے ساتھ مذہبی پیشوائیت کا بھی خاتمہ کر دیا۔ لیکن جب مسلمانوں میں ملوکیت کی دوبارہ نمود ہوئی تو فطری طور پر اس کے ساتھ مذہبی پیشوائیت

بھی جلوہ دہ محراب و منبر ہوگئی۔ اقبال نے قوم کو اس مہیب خطرہ سے بھی آگاہ کیا۔ اور عمر بھر سلطانی کے ساتھ، ملائی و پیری کے خلاف بھی مصروفِ جہاد رہا۔

قرآن کریم نے مذہبی پیشوائیت کے فتنہ کے سلسلہ میں کہا تھا کہ ۔ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۔ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ (۹/۳۴) یاد رکھو! یہ علماء اور مشائخ، عوام کی کمائی مفت میں کھا جاتے ہیں۔ یہ لوگوں سے کہتے یہ ہیں کہ ہم تمہیں خدا کا راستہ دکھاتے ہیں۔ حالانکہ خدا کے راستے میں سب سے بڑی روک خود یہی لوگ ہیں۔ ان کی ہر ممکن کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ اس راستے پر چلنے ہی نہ پائیں جو خدا نے ان کے لئے تجویز کیا ہے۔ انہی کے متعلق اقبال نے کہا ہے کہ ؎

یہی شیخِ حرم ہے جو چُرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ!

خدا اپنے رسولوں کی وساطت سے جو دین بھیجتا تھا وہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہوتا تھا جس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ دنیا سے ظلم و استبداد اور سلب و نہب پر مبنی ہر نظام کو مٹا کر اس کی جگہ نظامِ خداوندی متشکل کر دیا جائے۔ دین کے بنیادی تصورات اور ارکان و مناسک سب اسی انقلابی پروگرام کے اجزا ہوتے تھے مذہبی پیشوائیت کی ٹیکنیک یہ ہوتی تھی کہ دین کے ان تصورات کے الفاظ اسی طرح باقی رکھے جاتیں لیکن ان کا مفہوم بدل دیا جاتے۔ اس کے ارکان و مناسک کی ظاہری شکل و صورت وہی رہے لیکن وہ چند بے مقصد رسومات کا مجموعہ بن کر رہ جائیں۔ یوں "مذہبی پیشوائیت" کا وضع کردہ مذہب، دینِ خداوندی کی ممی شدہ لاش بن کر رہ جاتا تھا جس کے خط و خال تو وہی رہیں لیکن جس کی حقیقت ایک جسدِ بے روح سے زیادہ کچھ نہ ہو۔ اقبال نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے جب کہا کہ ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
مُلّا کی اذاں اور، مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں،
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

دوسرے مقام پر کہا ہے کہ ؎

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ تیرے دل میں اُتر جائے میری بات
یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات

وہ مذہب مردانِ خود آگاہ و خدا مست

یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

قرآنِ کریم نے فرعون کے خلاف سب سے بڑا الزام یہ عاید کیا تھا کہ جَعَلَ اَھْلَھَا شِیَعًا۔ یَسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْھُمْ۔ (۲۸/۴) وہ قوم میں افتراق پیدا کرتا رہتا۔ انہیں پارٹیوں میں تقسیم کر دیتا۔ کبھی ایک پارٹی کو اوپر چڑھا دیتا اور دوسری کو نیچے گرا دیتا۔ اور اس طرح انہیں کمزور کرتا رہتا کہ وہ اس کے خلاف اٹھنے نہ پائیں۔ قرآنِ کریم نے اُمت میں تفرقہ کو خدا کا عذاب قرار دیا اور واضح الفاظ میں کہا کہ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَھُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا۔ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْھِمْ فَرِحُوْنَ۔ (۳۰/۳۲) مسلمانو! دیکھنا تم ایک خدا پر ایمان لا کر کہیں پھر سے مشرک نہ بن جانا۔ یعنی تم فرقوں میں نہ بٹ جانا۔ فرقہ بندی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر فرقہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہے اور دوسروں کو باطل پر۔ اس طرح اُمت میں مسلسل پھوٹ پڑی رہتی ہے ملوکیت کا اس میں فائدہ ہوتا ہے۔ وہ یہ کام مذہبی پیشوائیت سے کراتی ہے۔ مذہبی پیشوائیت اُمت کو مختلف فرقوں میں بانٹ دیتی ہے۔ یہ فرقے ایک دوسرے کی تکفیر کرتے رہتے اور اس طرح انہیں باہم لڑاتے رہتے ہیں، اور ملوکیت اطمینان سے اپنی مفاد پرستیوں میں مصروف رہتی ہے۔ اقبالؒ نے جاوید نامہ میں سعید حلیم پاشا کی زبان سے اسی حقیقت کو واشگاف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ :-

دینِ حق از کافری رسوا تر است　　زانکہ مُلّا مومنِ کافر گر است

کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد　　ملت از قال و اقولش فرد فرد

مکتب و مُلّا و اسرارِ کتاب؟　　کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب

دینِ کافر فکر و تدبیرِ جہاد　　دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد

بالِ جبریل میں انہوں نے اسی حقیقت کو ذرا شوخ انداز میں بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ قیامت میں :-

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا　　حق سے جب حضرتِ مُلّا کو ملا حکمِ بہشت

عرض کی میں نے۔ الٰہی! میری تقصیر معاف　　خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لبِ کشت

نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقول　　بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت

ہے بد آموزیِ اقوام و ملل کام اس کا　　اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت

دین کے پروگرام کا ماحصل یہ تھا کہ جماعتِ مومنین، فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے، انہیں قرآن میں عطا کردہ مستقل اقدار کے مطابق، نوعِ انسان کی منفعت کے لئے عام کر دے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصدِ جلیل کے حصول کے لئے علومِ سائنس پر پوری پوری دسترس کے علاوہ، عالمگیر انسانیت کے مقتضیات اور عصرِ حاضر کے تقاضوں پر بھی

گہری نگاہ ہونی چاہیئے۔ لیکن جو کچھ ہماری مذہبی درسگاہوں میں پڑھایا جاتا ہے اس سے تو اتنا بھی معلوم نہیں ہو سکتا کہ سوئی کیسے بنائی جاتی ہے۔ اور یوٹیلیٹی نیشنز کس بلا کا نام ہے۔ ان درسگاہوں کے فارغ التحصیل "علمائے کرام" کو زندگی کے عملی مسائل سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ اسی لئے اقبالؒ نے کہا ہے کہ ؎

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اسکو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

اتنا ہی نہیں ۔ ان کے نصاب میں اٹھارہ اٹھارہ علوم تو ہوتے ہیں لیکن قرآن کریم کے لئے اس میں کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ جو علوم وہاں پڑھائے جاتے ہیں ان سے ان کے ذہنوں میں فرسودہ یونانی علم الکلام اور پامال شدہ عجمی تصورات اس طرح ٹھونس دیئے جاتے ہیں کہ ان میں دین کے مبادیات تک کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ اسی کا رونا روتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے	ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیئے
وہ رمزِ شوق جو پوشیدہ لاالٰہ میں ہے	طریقِ شیخ فقیہانہ ہو تو کیا کہیئے

طریقت

یہ تو اربابِ شریعت کا حال ہے۔ اصحابِ طریقت ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔ بالِ جبریل میں ہے۔ ؎

رمز و ایما اس زمانے کے لئے موزوں نہیں
اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن
"قم باذن اللہ" کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے!
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

دین کا انقلابی پروگرام یکسر مجاہدانہ زندگی کا متقاضی تھا جس کے لئے ایک ایسی جماعت کی ضرورت تھی جس کے رگ و پے میں بجلیاں بھری ہوئی ہوں۔ تصوف زندگی سے فرار سکھاتا ہے۔ اس لئے خدا کے دین سے اس کا تعلق کیا ہو سکتا ہے؟ — اقبالؒ کے الفاظ میں "تصوف اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے" — دین، قوموں کے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑا دیتا ہے۔ تصوف رگِ حیات میں رواں دواں خون کو منجمد کر کے رکھ دیتا ہے۔ دین، وہ شعلۂ جوالہ ہے جو باطل کے ہر نظام کو خس و خاشاک کی طرح راکھ کا ڈھیر بنا دیتا ہے۔ تصوف زندگی کی رہی سہی حرارت کو بھی افسردہ کر کے قوموں کو موت کی نیند سلا دیتا ہے۔ یہی وہ تاسف انگیز منظر تھا جسے دیکھ کر اقبالؒ نے ایک سرد آہ بھر کر کہا تھا کہ ؎

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال ٭ مُلا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار

وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستی کردار

اس نے اربابِ خانقاہیت کو پکار کر کہا کہ ؎

یہ حکمتِ ملکوتی یہ علمِ لاہوتی حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکرِ نیم شبی، یہ مراقبے یہ سرور تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اقبال سے بھی پہلے، ایک اور قرآنی نگاہ رکھنے والے مردِ مومن ۔۔۔ سرسید علیہ الرحمۃ ۔۔۔ نے ان اجارہ دارانِ روحانیت کے متعلق کہا تھا۔ کہ ۔۔۔ "مسکینی اور انکساری ان کو آسمان پر چڑھاتی ہے۔ اس لئے یہ اور زیادہ مسکین و منکسر بنتے ہیں۔ سادہ لوح پر لوگ فریفتہ ہوتے ہیں اس لئے یہ اور سادہ بنتے جاتے ہیں دنیا سے نفرت ان کو دنیا دلاتی ہے اس لئے یہ دنیا سے زیادہ نفرت کرتے جاتے ہیں۔ بے طمعی، محنت کے بغیر درہم و دینار دلاتی ہے اس لئے یہ اور زیادہ بے طمع ہوتے جاتے ہیں۔ لوگ ان کی ہر بات پر آمنا وصدقنا کہتے ہیں اس لئے ان کے دل میں دوسروں کی ہر بات کی حقارت جمتی جاتی ہے"۔

ان بظاہر "حجرہ نشینوں" کی یہ کیفیت ہے کہ لوگوں کو یہ دنیاوی آسائشوں اور زیبائشوں سے نفرت دلاتے رہتے ہیں۔ لیکن خود ان کے محلات ہر قسم کی عیش سامانیوں کے مراکز ہوتے ہیں۔ اقبال نے (بال جبریل میں) ایک "باغی مرید" کی زبان سے اسی حقیقت کی پردہ کشائی کی ہے۔ جب کہا ہے کہ ؎

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی!
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
شہری ہو دہاتی ہو، مسلمان ہے سادہ
مانندِ بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن
نذرانہ نہیں سود ہے پیرانِ حرم کا
ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن
میراث میں آئی ہے انہیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

یہ تھا ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا وہ دجل و فریب جس کے احساس سے اقبال نے خون کے آنسو روتے ہوئے بحضور رب العزت فریاد کی تھی کہ ؎

خدا وندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ سلطانی بھی عیاری ہے درویشی بھی عیاری

نظامِ سرمایہ داری

اس میں شبہ نہیں کہ ملوکیت کی گرہیں کسنے کے لئے پیشوائیت کی سحر آفرینی بڑی مؤثر ہوتی ہے لیکن اس میں یہ خطرہ ضرور ہوتا ہے کہ اگر لوگوں نے ذرا بھی علم و عقل سے کام لینا شروع کر دیا تو اس طلسمِ سامری کی نگاہ فریبی کا جال دھوآں بن کر اڑ جائے گا۔ اس کے لئے ایک اور حربہ استعمال کیا جاتا ہے۔

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ سرکس کا شیر اتنی مہیب قوتوں کے باوجود، رنگ ماسٹر کے سامنے بکری کیوں بنا رہتا ہے؟ اس لئے کہ اسے متواتر بھوکا رکھا جاتا ہے۔ بھوک وہ مؤثر ترین حربہ ہے جس سے بڑے بڑے قوی ہیکل سرکشوں کو گردن جھکانے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ انسانی دنیا میں اس حربہ کا نام نظامِ سرمایہ داری ہے جو حکمتِ ابلیس کا نادر شاہکار ہے۔ اس میں عیار طبقہ رزق کے سرچشموں پر سانپ بن کر بیٹھ جاتا ہے اور اس طرح جب لوگ روٹی کے لئے اس کے محتاج ہو جاتے ہیں تو ان سے جو کام چاہتا ہے لیتا ہے۔ دینِ خداوندی نظامِ سرمایہ داری کے خلاف کھلا ہوا چیلنج تھا۔ وہ اسے جڑ بنیاد سے اکھیڑنے کے لئے آیا تھا۔ نظامِ سرمایہ داری کی عمارت، فاضلہ دولت (یعنی ضرورت سے زیادہ سرمایہ جمع رکھنے) کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔ قرآن نے اس بنیاد ہی کو منہدم کر دیا۔ اور ضرورت سے زیادہ دولت جمع کرنے والوں کو عذابِ جہنم کا مستحق قرار دیا۔ اس نے واضح الفاظ میں کہا کہ — وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ — جو لوگ دولت کے انبار جمع کرتے رہتے ہیں اور اُسے دوسروں کی ضروریات کے لئے عام نہیں کرتے، اے رسول! تو ان سے کہہ دے کہ ان کی اس روش کا انجام الم انگیز تباہی ہوگا۔ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ — جس دن اس دولت کے سکوں کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور ان سے ان کی پیشانیوں، ان کے پہلوؤں اور ان کی پشت کو داغا جائیگا اور کہا جائے گا کہ — هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ۔ (۹/۳۴) — یہ ہے وہ دولت جسے تم نے اپنی ذات پر صرف کرنے کے لئے جمع کر رکھا تھا۔ لہٰذا اب اس دولت کا مزہ چکھو۔

نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد تو فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) پر ہوتی ہے۔ لیکن یہ فاضلہ دولت زمانہ قدیم میں زمینداری سسٹم سے حاصل ہوتی تھی۔ اور عصر حاضر میں نظامِ کارخانہ داری (انڈسٹری) کی رُو سے اکٹھی کی جاتی ہے۔ قرآن کریم نے نظامِ زمینداری کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ زمین، تمام نوعِ انسان کے لئے رزق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، اس لئے اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ۔ (۵۵/۱۰) "زمین کو ہم نے تمام مخلوق کے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے" اسلئے اسے سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ ۔ (۴۱/۱۰) ہر ضرورت مند کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہیئے۔ اس سے جس قدر رزق پیدا ہوتا ہے اس میں کاشتکار کی محنت شامل ہوتی ہے اور باقی سب کچھ فطرت کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ ملتا ہے۔ زمیندار فطرت کی ان بخشائشوں کو بھی اپنی ذاتی ملکیت بنا لیتا ہے۔ اور کاشتکار کی محنت کا بیشتر حصہ بھی ہتیا لیتا ہے۔ قرآن کریم اس حقیقت کو بڑے دلنشیں انداز سے بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ — اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۔ کیا تم نے اس پر بھی کبھی غور کیا ہے کہ تم جو کھیتی کرتے ہو تو اس میں تمہارا حصہ کسقدر ہوتا ہے اور ہمارا کسقدر۔ تم زمین میں ہل چلا کر تخم ریزی کر دیتے ہو۔ اس کے بعد ءانتم تزرعونہ ام نحن الزارعون ۔ کیا اس دانے کو تم اگاتے ہو یا ہمارا قانون ایسا کرتا ہے؟ لو نشاء لجعلنٰہ حطاما فظلتم تفکھون انا لمغرمون ۔ بل نحن محرومون ۔ اگر ایسا ہمارا قانونِ مشیت ساتھ نہ دیتا تو کھیتی کا اگنا تو ایک طرف تمہارا بیج بھی ضائع ہو جاتا۔ اور تم سر پکڑ کر بیٹھ جاتے کہ ہم پر مفت میں چٹی پڑ گئی۔ افرءیتم الماء الذی تشربون ۔ پھر تم نے کبھی اس پانی پر بھی غور کیا ہے جس پر زندگی کا اور کھیتی کا دار و مدار ہے ءانتم انزلتموہ من المزن ام نحن المنزلون ۔ کیا اسے تم بادلوں سے برساتے ہو یا ہم ایسا کرتے ہیں؟ لو نشاء جعلنٰہ اجاجا فلولا تشکرون ۔ اگر ہمارا قانونِ مشیت ساتھ نہ دیتا اور جس طرح کا تلخ اور نمکین پانی سمندر میں تھا ویسا ہی یہ بادلوں سے برستا۔ تو کھیتی کا اگنا تو ایک طرف تم خود بھی زندہ نہ رہ سکتے۔ افرءیتم النار التی تورون ۔ پھر کیا تم اس آگ پر غور نہیں کرتے جسے تم جلاتے ہو اور جس کی حرارت میں زندگی کا راز سربستہ ہے ءانتم انشاتم شجرتھا ام نحن المنشئون ۔ کیا درختوں کی سبز شاخوں میں اس شعلہ سامانی کو ہم نے محفوظ رکھ کر چھوڑا ہے یا تم نے ایسا کیا ہے۔ نحن جعلنٰھا تذکرۃ ۔ ہم نے اس داستان کو اس لئے دہرایا ہے کہ تمہیں ایک فراموش کردہ حقیقت کی یاد دہانی کرا دی جائے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ زراعت کا یہ سارا کاروبار تمہارا اور ہمارا مشترکہ ہے اس لئے اس کے ماحصل میں سے تم اپنا حصہ لے لو اور ہمیں ہمارا حصہ دے دو۔ تم پوچھو گے کہ ہمارا حصہ ہم کسے دیں؟ سو سن لو کہ متاعا للمقوین ۔ (۵۶/۶۳-۷۳) اسے بھوکوں کو دے دو۔ یہ ہم تک پہنچ جائے گا۔ اقبالؒ نے انہی آیات کے مفہوم کو اپنے حسین انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب

کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار
خاک یہ کس کی ہے، کس کا ہے یہ نورِ آفتاب

کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب

دہ خدایا! یہ زمین تیری نہیں، تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں، میری نہیں

(بالِ جبریل)

پھر اس نے صنعتی نظام (انڈسٹری) کی چکی میں پستے ہوئے خاک نشیں مزدور کو اٹھا کر گلے سے لگایا اور اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا کہ ؎

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر — شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی — اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار — انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اقبال نے "بندۂ مزدور" کو یہ پیغام ۲۳-۱۹۲۲ء میں دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے بالِ جبریل اور ضربِ کلیم میں اسی پیغام کو اور بھی زیادہ واشگاف الفاظ میں دہرایا۔ بالِ جبریل میں ایک نظم کا عنوان ہے ــ فرشتوں کا گیت ــ اس میں ملائکہ خدا سے شکوہ سنج ہیں کہ ؎

عقل ہے بے زمام ابھی، عشق ہے بے مقام ابھی — نقش گرِ ازل! ترا نقش ہے ناتمام ابھی
خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر — تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی

تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند بام ابھی

اس پر خدا کی طرف سے فرشتوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ ؎

اٹھو! مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو! — کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو!
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو!
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے — پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو!
حق را بسجودے، صنماں را بطوافے — بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو!
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے — میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو!

"فرشتے" وہ کائناتی قوتیں ہیں جو مشیتِ خداوندی کے پروگرام کو بروئے کار لانے کے لئے "زمانے کے تقاضوں" کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ یہی وہ "زمانے کے تقاضے" تھے جنہیں دیکھ کر اقبال کی نگہِ دوربین نے بہت عرصہ پہلے اس حقیقت کو بھانپ لیا تھا کہ اب ؎

زمانے کے انداز بدلے گئے — نیا راگ ہے، ساز بدلے گئے
پرانی سیاست گری خوار ہے — زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

گیا دورِ سرمایہ داری گیا   تماشا دکھا کر مداری گیا

حتیٰ کہ انہوں نے یہاں تک بھی کہہ دیا کہ ؎

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے   ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے

یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے جب ہنوز (شاید) خود چینیوں کو بھی اپنے سنبھلنے کا حتمی طور پر اندازہ نہیں ہوا ہوگا۔ قرآن پر غور و فکر، انسان میں ایسی بصیرت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ حوادثِ زمانہ سے اس کا اندازہ کر سکتا ہے کہ اب ہوا کا رُخ کدھر کو ہے۔

قرآن نے نظامِ سرمایہ داری کے ختم کرنے کے سلسلہ میں کہا تھا کہ - یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ - اے رسولؐ! تجھ سے یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی کمائی میں سے کس قدر، دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیں۔ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) - ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زائد ہے سب کا سب، جب روس میں اشتراکی انقلاب آیا تو اقبالؒ نے کہا کہ ؎

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم   بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ گفتار

انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر   کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں   اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

جو حرفِ قُلِ الْعَفْو میں پوشیدہ ہے اب تک

اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

"شاید" اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ روس نے جس اشتراکی نظام کی ایسی عظیم عمارت استوار کرنے کا دعوےٰ کیا ہے، اس کے ہاں ایسی بنیاد کوئی نہیں جو اس عمارت کا بوجھ اٹھا سکے۔ اُس نے اہلِ روس سے اُسی زمانے میں کہا تھا کہ ؎

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے   جستہٖ او را اساسِ محکمے؟

یہ بنیاد قرآن کے علاوہ اور کہیں سے نہیں مل سکتی۔ اس لئے ؎

داستانِ کہنہ شستی باب باب

فکر را روشن کن از اُمّ الکتاب

اور آپ دیکھ رہے ہیں عزیزانِ گرامی قدر! کہ اس اساسِ محکم کے نہ ہونے کی وجہ سے، روس میں اشتراکیت کس بُری طرح سے ناکام ہو رہی ہے۔ یہ معاشی نظام، قرآن ہی کی بنیادوں پر کامیابی سے اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس حقیقت کو اقبالؒ نے "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" کی نظم کے آخری بند میں نہایت اُجلے، نکھرے اور حسین و شاداب

انداز میں بیان کیا ہے۔ اسے غور سے سنیئے ۔

ابلیس کی کابینہ کے مشیر مال نے کہا کہ دنیا میں اشتراکیت کا چرچا عام ہو رہا ہے۔ اس لئے مجھے خطرہ ہے کہ ہمارا وضع کردہ نظام سرمایہ داری کہیں پامال نہ ہو جائے۔ اس لئے ہمیں اس کی بابت کچھ فکر کرنی چاہیئے۔ ابلیس نے یہ سن کر کہا کہ تم نے صحیح نہیں سمجھا۔ مجھے اشتراکیت سے کچھ خطرہ نہیں۔ یہ ہمیں شکست نہیں دے سکتی۔ ہمارے لئے خطرہ کا گوشہ ایک اور ہے جس کی طرف تم میں سے کسی کی بھی نگاہ نہیں گئی۔

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں ، اسلام ہے

اس پر اس کے مشیروں کی آنکھوں میں خفیف سی ہنسی پھر گئی۔ جو اس تنقید کی غماز تھی کہ موجودہ مسلمان قوم سے بھلا ہمیں کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟ اس پر ابلیس نے کہا کہ ؎

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

کون سی شرعِ پیغمبر؟

الحذر! آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر حافظِ ناموسِ زن ، مرد آزما ، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے نے کوئی فغفور و خاقاں ، نے فقیرِ رہ نشیں

کرتا ہے دولت کو ہر آسودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں !
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں !

یہ ہے ہمارے لئے حقیقی خطرہ کا موجب ــــ اس لئے ؎

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

اب ابلیس کے مشیروں کی سمجھ میں آیا کہ ان کے لئے حقیقی خطرہ کیا ہے۔ اس پر انہوں نے ابلیس سے پوچھا کہ اس خطرہ کی روک تھام کے لئے ہمیں کیا پروگرام اختیار کرنا چاہیئے۔ اس نے کہا کرنا کیا چاہیئے؟ ــــ وہی جو ہم کرتے چلے آئے ہیں۔ تم جاؤ اور اپنے نظام کی آلۂ کار مذہبی پیشوائیت کو کھٹکھٹاؤ اور اس سے کہو کہ وہ مسلمانوں کو اس قسم کے اختلافی اور نظری مسائل میں الجھائے رکھیں کہ ؎

ابن مریم مرگیا یا زندۂ جاوید ہے ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات

ذرا سوچو۔ کہ ؎

کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات

اسے ان نظری مسائل کے الجھاؤ میں ڈالے رکھو۔ اور اس طرح ؎

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے!
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات!

لہٰذا تم پوری کوشش سے ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اس سے زیادہ اور کچھ کرنے کا کام نہیں ــــ یہ ہوگیا تو تم چین کی نیند سوؤ۔ اس سے یہ قوم، ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری کی زنجیروں میں جکڑی رہے گی اور ہمارا پورا لاؤ لشکر فسادِ آدمیت کے پروگرام کی تکمیل میں آزادانہ مصروف رہے گا۔

پاکستان ــــ اقبالؒ نے ابلیس کی اسی سازش کو ناکام بنانے کے لئے پاکستان کا تصور دیا تھا۔

پاکستان سے اس کی مراد تھی ایک ایسا خطۂ زمین جس میں قوانینِ خداوندی کی حکمرانی ہو تاکہ اسلام پر جو ملوکیت کا ٹھپہ لگ چکا ہے وہ دور ہو جائے۔ مذہبی پیشوائیت کا اقتدار ختم ہو اور سرمایہ داری کی جگہ صحیح قرآنی نظامِ معیشت رائج کیا جا سکے۔ اس سے "اشتراکیت" کو وہ اساسِ محکم میسر آ جائے گی جس کے بغیر وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

۱۹۴۶ء میں وہ خطۂ زمین ہمیں مل گیا۔ لیکن اُس وقت وہ حکیم الامت یہاں سے جا چکا تھا۔ اگر وہ اِس وقت موجود ہوتا تو ہمیں "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" کی اُس نشست کی روئیداد بھی اپنے الفاظ میں سناتا جو حصولِ پاکستان کے وقت، ہنگامی طور پر منعقد ہوئی تھی۔ اس کی تفصیل کچھ اس قسم کی ہوتی کہ جب تقسیمِ ہند کا اعلان ہوا تو ابلیس کے مشیر چیختے چلاتے اس کے پاس آئے اور کہا کہ جہاں پناہ! غضب ہو گیا۔ تحریکِ پاکستان کامیاب ہو گئی، مسلمانوں کو ایک آزاد مملکت قائم کرنے کے لئے جداگانہ خطۂ زمین مل گیا۔ اس تحریک کے قائد نے بہت پہلے اعلان کر دیا تھا کہ اسلامی مملکت، جس کے قیام کے لئے ہم جدوجہد کر رہے ہیں، قرآنی احکام و قوانین نافذ کرنے کی ایجنسی ہوتی ہے۔ اس نے زمینداروں اور سرمایہ داروں کو وارننگ دے دی تھی کہ تمہیں اپنی روش بدلنی پڑے گی۔ ایسا نہ کرو گے تو تمہارے لئے پاکستان میں کوئی جگہ نہیں ہو گی۔ کیونکہ وہاں نظامِ سرمایہ داری نہیں چل سکے گا۔ اس نے ابھی ابھی (۱۹۴۶ء میں) ایک براڈ کاسٹ میں کہا ہے کہ پاکستان میں تھیاکریسی نہیں ہو گی۔ ہم نے دس برس تک مذہبی پیشوائیت کو برابر آگے بڑھائے رکھا کہ وہ تحریکِ پاکستان کی مخالفت کرے، اور "خدا و رسول" کے نام پر عوام کو اس کی حمایت کرنے سے باز رکھے۔ لیکن ان کی کسی نے نہ سُنی اور وہ تحریک کامیاب ہو گئی۔ اب اس خطۂ زمین میں قرآنی نظام قائم ہو جائے گا۔ اور ہماری حکمرانی ختم ہو جائے گی — عالی جاہ! یہ کیا ہو گیا؟ — یہ کیسا انقلاب آ گیا؟ ؎

چھا گئی آشفتہ ہو کر وسعتِ افلاک پر
جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشتِ غبار
فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج
کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار
میرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے تفکر تیری سیادت پر مدار

ابلیس نے یہ سب کچھ خاموشی سے سنا۔ اور اس کے بعد نہایت سکون و اطمینان سے کہا کہ

کہ اس میں شبہ نہیں کہ یہ انقلاب ہمارے لئے ایک بہت بڑے فتنہ کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ لیکن اس سے اس طرح گھبرانے اور چیخ و پکار کرنے کی کوئی بات نہیں۔ مسلمان مذہب پرست قوم ہے۔ اسے اسی راستے سے بہکایا جا سکتا ہے۔ اسلام دشمن قوتیں بے نقاب ہو کر سامنے آئیں تو مسلمان ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے۔ لیکن یہی قوتیں جب مذہب کا لبادہ اوڑھ کر آئیں تو یہ سادہ لوح نہایت آسانی سے ان کے دامِ فریب میں آجاتا ہے۔ لہٰذا تم اپنی قوتوں کو ایک بار پھر مجتمع کرو۔ ان کا جال سارے ملک میں بچھا دو۔ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ۔ ان کی پراپیگنڈے کی مشینری کو تیز تر کر دو۔ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ۔ اپنے لاؤ لشکر کو ان کے (Disposal) پر چھوڑ دو کہ یہ چاروں طرف سے اس امت پر یورش کریں۔ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ۔ روپے پیسے سے ان کی مدد کرو۔ اور ایسا انتظام کرو کہ قوم کا نوجوان طبقہ ان کی گرفت میں رہے۔ وَعِدْهُمْ۔ (۱۷) اور انہیں حکومت و اقتدار کے سبز باغ دکھا دکھا کر اپنے پیچھے لگائے رہو۔ تم یہ کچھ کرو اور پھر دیکھو کہ اس خطۂ زمین[۶۴] میں بھی تمہاری حکمرانی کس طرح بدستور قائم رہتی ہے۔ یہ میرے مدتوں کے آزمائے ہوئے تیر ہیں جن کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا۔ تم نے دیکھا نہیں کہ انہیں حربوں سے میں نے مسلمانوں کی اتنی اتنی بڑی مملکتوں کی حالت کیا بنا رکھی ہے؟ وہاں کے مسلمانوں کی کیفیت یہ ہے کہ ؎

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں!
ہو اگر پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام

تم دیکھتے نہیں کہ ؎

یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام

تمہارے لئے گھبرانے کی کوئی بات نہیں ؎

ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا
کُند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغ بے نیام

ان حربوں نے جو کچھ ان ممالک میں کیا ہے، وہی کچھ اس نو زائیدہ مملکت میں بھی کیا جا سکتا ہے جب تک دنیا میں مذہبی پیشوائیت باقی ہے ہمارے لئے خطرہ کی کوئی وجہ نہیں۔ تم اسے ہر طرح سے تقویت پہنچاتے رہو اور جو پروگرام میں نے پہلے تجویز کیا تھا اس پر اور بھی زیادہ شدت سے عمل پیرا ہو جاؤ۔ یعنی جہاں جہاں بھی مسلمان نظر آئے ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اس پروگرام کے مطابق، تشکیلِ پاکستان کے ساتھ ہی، وہ مذہبی پیشوائیت، جو مسلسل دس سال تک تحریکِ پاکستان کی مخالفت کرتی چلی آرہی تھی، پاکستان میں آن موجود ہوئی۔ اقبال اس سے بہت پہلے دنیا سے جا چکا تھا؛ اور جناح، قیامِ پاکستان کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ہم سے رخصت ہو گیا۔ اس لئے مذہبی پیشوائیت کو یہاں پوری طرح کھل کھیلنے کا موقعہ مل گیا۔ اس نے سب سے پہلے یہ اعلان کیا کہ

> چونکہ پاکستان، اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اور حصولِ پاکستان کی تحریک اسی مقصد کے تحت چلائی گئی تھی کہ یہاں اسلامی حکومت قائم کی جائے ..... اور چونکہ یہاں مسلمانوں کی قومی قیادت اب تک جن لوگوں کے ہاتھوں میں رہی ہے، وہ ایک اسلامی حکومت کو چلانے کی صلاحیت سے عاری محض ہیں۔ لہٰذا انہیں چاہیئے کہ وہ مسندِ قیادت و سیادت سے دستبردار ہو جائیں اور ایک نئی قیادت کے لئے جگہ خالی کر دیں۔

اٹھارہ سال سے مسلسل یہاں یہی جنگ جاری ہے جس نے قوم کو ان مقاصد کے حصول کی طرف آنے ہی نہیں دیا جن کی خاطر پاکستان کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ ملک کا سرمایہ دار طبقہ حسبِ معمول اس جنگ میں مذہبی پیشوائیت کے ساتھ ہے کیوں کہ مذہبی پیشوائیت ان کے مفاد کی پوری پوری نگہداشت کرتی ہے۔ مثلاً یہاں جب یہ تجویز سامنے آئی کہ اللہ کی زمین، جاگیرداروں اور زمینداروں کے قبضہ سے نکال کر غریب کاشتکاروں کو دے دی جائے اور اس نہج کا قانون پاس کر دیا جائے کہ کسی شخص کے قبضہ میں اتنے ایکڑ سے زیادہ اراضی نہیں رہنے پائے گی تو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے یہ فتوے صادر فرما دیا گیا کہ ایسا کرنا خلافِ شریعت ہے۔

> اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی ..... روپیہ، پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت پر کوئی حد نہیں .... وہ جس طرح ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو، اس طرح وہ تم سے یہ بھی

نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔

(مسئلہ ملکیت زمین۔ از سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، ص [illegible])

جب یہ سوال سامنے آیا کہ اتنے اتنے بڑے کارخانے، سرمایہ داروں کی ذاتی ملکیت ہیں، انہیں ان کی ذاتی ملکیت سے نکال کر قوم کی مشترکہ تحویل میں دے دیا جائے تاکہ ان کی آمدنی قوم کے اجتماعی مفاد کے کام آئے تو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے فتویٰ صادر ہو گیا کہ

ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کا تخیل بنیادی طور پر اسلام کے نقطۂ نظر کی ضد ہے۔ (مسئلہ ملکیت زمین ص [illegible])

نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ملک کی ساری دولت سمٹ کر چند گھرانوں میں محدود ہو گئی ہے اور غریب طبقہ دن بدن روٹی تک کا بھی محتاج ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مذہبی پیشوائیت خوش ہے کہ ان کا جہادِ عظیم کامیاب ہو رہا ہے اور سرمایہ دار مطمئن کہ اسلام کی ڈھال ان کے لئے تیار کر دی گئی ہے جس کے پیچھے وہ جو جی میں آئے کر سکتے ہیں۔

لیکن اس میں عزیزانِ من! گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ جب ابلیس اپنے مشیروں کو یہ پروگرام دے رہا تھا تو آنسوئے افلاک سے یہ نشیدِ جلال بھی اس کے کانوں میں پہنچ رہی تھی کہ تم جو جی میں آئے کر دیکھو۔ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ۔ (۱۵/۴۲) — میرے بندوں پر تیرا کوئی جادو نہیں چل سکے گا — وہ بندے کہ

جن کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

وہ شمعِ قرآن کو لے کر اٹھیں گے اور تمہارے مکر و حیل کی پھیلائی ہوئی تاریکیوں کے پردے چاک کر کے، ان کے پیچھے چھپے ہوئے ایک ایک چہرے کو بے نقاب کرتے جائیں گے۔ یہ کشمکش نئی نہیں۔ یہ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز!
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

اور تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں کہ جہاں اور جب بھی "چراغِ مصطفوی" کے علمبرداروں نے استقامت سے کام لے کر اپنی جدوجہد جاری رکھی "شرارِ بولہبی" خاکستر ہو کر رہ گیا۔ اور "فرعون، ہامان اور قارون" کا متحدہ محاذ بھی اسے بجھنے سے بچا نہ سکا۔ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا (۶/۴۵) اس طرح ہر ظلم کرنے والی جماعت کی جڑ کٹ گئی؛ — وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ۔ (۴۰/۷۸) — اور قرآنی نظام کی مخالفت کرنے والی ہر قوت خاکستر و نامراد رہ گئی۔ یہی پہلے ہوا ہے یہی اب ہو گا۔ حقیقت

ہے نہیں میکدۂ تخیل کی یہ خلاقی۔

اور یہ اس دن ہوگا جب مسلمانوں میں خدا کے عطا کردہ دین اور مذہبی پیشوائیت کے خود ساختہ مذہب میں فرق کرنے والی نگاہ پیدا ہو گئی۔ اور اس قسم کی نگاہ، قرآن کے علاوہ اور کہیں سے نہیں مل سکتی۔ یہی وجہ ہے جو اقبال نے کہا تھا کہ ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

لہٰذا عزیزانِ من! ہمارے لئے اقبال کا پیغام یہ ہے — اور یہ پیغام اقبال کا نہیں، درحقیقت قرآن کا پیغام ہے — کہ اس خطۂ زمین، ارضِ پاکستان، کی حفاظت کا پورا پورا سامان کیا جائے — کہ اگر یہ خطۂ زمین ہی (خدا نکردہ) باقی نہ رہا تو قرآنی نظام نافذ کس جگہ ہو سکے گا — اور جو تخریبی قوتیں، اسلام کے نام پر ملک میں انتشار پیدا کرتی ہیں، ان کے فریب میں نہ آیا جائے، اور اس کے ساتھ ہی ملک میں قرآنی پیغام کو عام کرتے جائیں۔ جب یہ پیغام فضا میں عام ہو گیا تو تخریبی قوتیں اس طرح کافور ہو جائیں گی جس طرح طلوعِ سحر سے رات کی تاریکی کفن پوش ہو جاتی ہے۔ اگر آپ نے ایسا کر لیا تو یقین جانئے کہ ؎

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار!
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

وَ اٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

لاہور میں ——— پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

ہر اتوار کی صبح ۸ بجے ان کے مکان واقعہ ۲۵/بی گلبرگ میں ہوتا ہے۔ آجکل قرآن کریم کے آخری پارے زیرِ درس ہیں۔

(ناظم ادارہ)

پیشۂ وکالت

(اسلامی نقطۂ نظر سے)

جماعت اسلامی نے آئندہ الیکشن کے لئے تیاریاں شروع کر دی ہیں. چنانچہ اس سلسلہ میں امیر جماعت اور ان کے رفقاء نے ملک گیر دوروں کا پروگرام بنا لیا ہے. ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں، لیکن دیکھئے کہ اس کے لئے ہتھکنڈے کیا استعمال کئے جاتے ہیں. جماعت کے ترجمان (ایشیا، بابت ۵ر اپریل ۱۹۷۰ء) میں شائع شدہ رپورٹ کے مطابق، میاں طفیل محمد صاحب، امیر جماعت اسلامی مغربی پاکستان نے ۱۰ر مارچ کو بار کونسل ساہیوال سے خطاب فرمایا. اس خطاب کا پہلا پیراگراف یہ ہے :-

> آپ کا تعلق ایک ایسے طبقے سے ہے جو ملک و قوم میں اپنی خدمات کے لحاظ سے ایک اونچا مقام رکھتا ہے مسلمانوں کی لیڈرشپ ہمیشہ ماہرینِ قانون کے ہاتھوں میں رہی ہے. امام ابو حنیفہ، امام محمد، امام یوسف رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین سب ماہرِ قانون ہی تو تھے. اور مسلم معاشرے کے نباض کی حیثیت سے ان کی راہ نمائی پر کامل اعتماد کیا جاتا تھا آج آپ بھی اسی مسند پر بیٹھے ہوتے قوم کو اپنی طرف بلا رہے ہیں. آپ کے کاندھوں پر ایک زبردست ذمہ داری کا بوجھ ہے جسے انتھک لگن اور مسلسل کاوش سے ہی آپ اٹھا سکتے ہیں

یقیناً ملک کا وکلا کا طبقہ، ایک ایسی جماعت کے ترجمان کی زبان سے جو اقامتِ دین کی علمبردار اور احیاءِ اسلام کی داعی ہے، اپنے حق میں ان الفاظ کو سن کر بہت خوش ہوا ہوگا. اور ایسا ہونا بھی چاہیئے. امام ابو حنیفہؒ امام محمدؒ اور امام یوسفؒ جیسی ہستیوں کی ہم مسندی کے شرف سے بڑھ کر اور کون سی عزت باعثِ فخر ہو سکتی ہے :

لیکن ہم ان حضرات کی خدمت میں عرض کریں گے کہ وہ اپنے اس نئے اعزاز پر فخر کرنے سے پہلے، یہ بھی دیکھ لیں کہ خود امیر جماعت، سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب، اس سے پیشتر ان کے حق میں کیا فتویٰ صادر

فرما چکے ہیں۔ یہ بات ہے ۱۹۴۶ء کی جب مودودی صاحب کو الیکشن کے سلسلہ میں وکالت پیشہ حضرات کی امداد کی ضرورت نہیں تھی۔ (اور جسے یہ اپنا مدِّمقابل سمجھتے تھے۔ یعنی محمد علی جناح۔ بدقسمتی سے اس کا تعلق اسی پیشے سے تھا) اس وقت ایک صاحب نے ان سے حسبِ ذیل سوال پوچھا۔

> میں نے حال ہی میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا ہے اور اس پیشہ میں خاصا کامیاب ہوا ہوں لیکن میں دیکھتا ہوں کہ ایک وکیل کو قوانینِ الٰہیہ کے برخلاف روزانہ قوانینِ انسانی کی بنا پر مقدمات لڑانے پڑتے ہیں۔ وہ اپنا پورا زور لگا کر اس چیز کو حق ثابت کرتا ہے جسے انسانی قوانین حق قرار دیتے ہیں خواہ خدائی قانون کی رُو سے وہ حق ہو یا نہ ہو۔ اور اسی طرح باطل اسے ثابت کرتا ہے جو ان قوانین کی رُو سے باطل ہے خواہ قانونِ الٰہی کے تحت وہ حق ہی کیوں نہ ہو۔ محتاط سے محتاط وکیل بھی عدالت کے دروازے میں قدم رکھتے ہی معًا حق و باطل اور حقوق اور ذمہ داریوں کے اس معیار کو تسلیم کرتا ہے جس کو انسان کی خام کار عقل نے اپنی خواہشاتِ نفس کے ماتحت مقرر کر رکھا ہے۔ غرضیکہ ایک وکیل کفر کی اچھی خاصی نمائندگی کے فرائض انجام دیتا ہے لیکن کوئی اور پیشہ بھی مجھے ایسا نظر نہیں آتا جسے اختیار کر کے انسان نجاستوں سے محفوظ رہ سکے۔ اس دوسری مشکل کا حل کیا ہے؟ میں یہ سوال اس مسافر کی طرح پوری آمادگیٔ عمل کے ساتھ کر رہا ہوں جو پا بہ رکاب کھڑا ہو۔

سوال آپ نے سن لیا۔ اب مودودی صاحب کے قلم سے اس سوال کا جواب بھی سن لیجئے۔ آپ نے فرمایا:۔

> اپنے پیشہ کے متعلق آپ نے جو رائے قائم کی ہے وہ سو فیصدی صحیح ہے اور آپ کی سلامتِ طبع پر دلالت کرتی ہے۔ آپ جیسے سلیم الطبع لوگوں کے لئے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ ایک کافرانہ نظام جب کلی طور سے کسی سرزمین پر چھا چکا ہوتا ہے تو اس کے ماتحت رہتے ہوئے کسی شخص کا خالص حلال رزق حاصل کرنا اور مطابقِ شرع زندگی بسر کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔ سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ زیادہ حرام سے بچ کر کم حرام اور ناگزیر حرام کو برداشت کیا جائے اور بغاوت سے بچ کر ایسی معصیت کو مجبوراً گوارا کیا جائے جس سے بچنا ممکن نہیں ہے۔ وکالت کو آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ قانونِ الٰہی کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔ اس کے مقابلہ میں اگر کسی دوسرے پیشہ میں کچھ حرام کی آمیزش ہو بھی تو بہرحال وہ بغاوت سے تو کم درجہ ہی کا گناہ ہے۔ تجارت، زراعت، صنعت و حرفت، مزدوری، پرائیویٹ فرموں کی ملازمتیں اور اسی قسم کے دوسرے پیشوں میں ایسی صورتیں بہم پہنچ سکتی ہیں جن کے اندر کم سے کم ناگزیر معصیت کی حد پر آدمی قائم رہ سکتا ہے اور وہ کم از کم اس درجہ میں تو حرام نہیں ہیں جس درجہ کی یہ وکیلانہ بغاوت حرام ہے۔

پھر ان سے پوچھا گیا۔

"کاسبِ حرام کے ہاں نوکر رہنا یا اس کے ہاں سے کھانا پینا جائز ہے یا نہیں؟"

اس کے جواب میں مودودی صاحب نے فرمایا:

کاسبِ حرام کی دو نوعیتیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جس کا پیشہ فحشا کی تعریف میں آتا ہو۔ مثلاً زنانِ بازاری کا کسب۔ اس کے قریب جانا بھی جائز نہیں، کجا یہ کہ اسکے ہاں نوکر ہونا۔ دوسرا وہ کاسبِ حرام ہے جس کا پیشہ حرام تو ہے لیکن فحشا کی تعریف میں نہیں آتا۔ جیسے وکیل۔ یا سودی ذرائع سے کمانے والا۔ اس کے کسی ایسے کام میں نوکری کرنا جس میں آدمی کو خود بھی حرام کام کرنے پڑتے ہیں، مثلاً سود خوار کی سودی رقمیں فراہم کرنے کا کام، یا وکیل کے محرر کا کام، تو یہ حرام ہے۔ لیکن اسکے ہاں ایسے کام پر نوکری کرنا یا مزدوری کرنا جو بجائے خود حلال نوعیت کا ہو، مثلاً اس کی روٹی پکا دینا، یا اس کے ہاں سائیس یا ڈرائیور کا کام کرنا، یا اس کا مکان بنانے کی مزدوری تو اس میں کوئی جرم نہیں رہا اس کے ہاں کھانا کھانا، تو اس سے پرہیز ہی اولیٰ ہے۔

(ملاحظہ ہو ترجمان القرآن، بابت جنوری، فروری ۱۹۶۷ء ص ۸۶، ۸۳)

یعنے وکالت کا پیشہ حرام۔ اس کی کمائی حرام، وکیل کی محرری حرام — ان کے ہاں سے کھانے پینے سے پرہیز اولیٰ۔

اور اب وہی وکلاء حضرات ہیں، وہی ان کا پیشہ ہے۔ وہی ان کا بولے زور سے اس چیز کو حق ثابت کرنا جسے انسانی قوانین حق قرار دیتے ہیں، خواہ خدائی قانون کی رُو سے وہ حق ہو یا نہ ہو۔ لیکن اب یہ حضرات امام اعظمؒ، امام محمدؒ اور امام یوسفؒ کے ہم پایہ اور اپنی خدمات کے اعتبار سے قوم میں اونچے مقام کے مستحق! خود امیرِ جماعت ان کے ہاں جاکر مہمان ہوتے ہیں — اُن کی زبان سے اپنے حق میں سپاسنامے سُنتے ہیں اور اُن کے جواب میں ان کی شان میں قصائد پڑھتے ہیں!

وہ بھی عین مطابق شریعت — اور یہ بھی عین مطابق شریعت

اور اس کے باوجود، انہی وکلاء حضرات میں سے بعض ہم پر اعتراض کرتے ہیں کہ آپ جماعت اسلامی کی مخالفت کیوں کرتے ہیں؟ ہم انہی حضرات سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ جس جماعت کا چلن یہ ہو، کیا اس قسم کے مکر و فریب کو تقویت دینے کے لئے ان کی تائید و اعانت کی جائے یا اُن کے "مقدس نقابوں" کو اٹھا کر سادہ لوح مسلمان کو ان کی حقیقت سے آگاہ کیا جائے؟ — فرمائیے! اس باب میں آپ کا کیا

ارشاد ہے؟

اس کے بعد (ان وکلاء حضرات سے) ہماری ایک گزارش اور بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ اس کے بعد جب یہ حضرات آپ کے پاس تشریف لائیں تو ان سے ذرا یہ دریافت فرمایئے کہ ۱۹۶۲ء کے فتوے کے متعلق ان کا کیا ارشاد ہے؟

اگر یہ کہیں (جیسا کہ الیکشن میں حصہ لینے کے جواز میں یہ حضرات کہا کرتے ہیں) کہ قرار دادِ مقاصد پاس کرنے سے یہ مملکت مسلمان ہو گئی ہے" تو ان سے پوچھئے کہ پھر یہ اس "مسلمان مملکت" کی مخالفت کیوں کرتے ہیں؟ اور اس پر اگر ان کا جواب یہ ہو کہ اس ملک میں اسلامی قوانین رائج نہیں کئے گئے، اس لئے ہم اس کی مخالفت کرتے ہیں، تو ان سے کہیئے کہ عدالتوں میں انہی غیر اسلامی قوانین کی مدافعت و حمایت وکالۃً کرتے ہیں۔ پھر وہ ۱۹۶۲ء کا فتویٰ کیسے بدل گیا۔

بینک کی ملازمت

یہ تو رہا پیشۂ وکالت کے متعلق۔ اب لگے ہاتھوں، آپ بنک کی ملازمت کے متعلق بھی مودودی صاحب کا فتوے سن لیجئے، جو حال ہی میں (ایشیا۔ ۱۳ مئی ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے سوال اور جواب دونوں ملاحظہ فرمایئے، تاکہ یہ نہ کہا جائے کہ "سیاق و سباق" سے الگ کر کے عبارت نقل کی گئی ہے۔

"سوال:۔ کیا اسلامی حکومت میں بینکنگ جائز ہے۔ اور وہ لوگ جو بنکوں میں ملازمت کر رہے ہیں ان کی ملازمتیں جائز اور درست ہیں؟

جواب:۔ بنکنگ تو اس چیز کا نام ہے کہ کسی ایجنسی کے ذریعے کاروبار چلائے جا سکیں۔ اور اسلام اس راہ میں رکاوٹ نہیں ہے۔ بینکنگ کی ایک شکل وہ بھی تھی جو حضرت امام ابو حنیفہؒ کے زمانے میں رائج تھی اور خود آپ کی دکان بہت بڑے پیمانے پر یہ کام سرانجام دے رہی تھی۔

موجودہ زمانے کے بینکوں کی اصل خرابی یہ ہے کہ وہ سود کے ذریعے سے سارا کاروبار چلاتے ہیں۔ اور روپیہ بھی سود کے نام پر جمع کیا جاتا ہے۔ ان حالات میں موجودہ بنکوں کی ملازمت ایسی ہی ہے جیسے کوئی قحبہ خانے یا شراب خانے میں ملازمت کرے۔

حقائق و عبر

۱۔ مذہبی پیشوائیت کی "برکات"

اسلام کا اجتماعی نظام یہ ہے کہ ہر اختلافی معاملہ کا فیصلہ حکومت کے مرکز کی طرف سے ہو۔ اس سے امت کی وحدت قائم رہتی ہے۔ صدرِ اول میں جب تک یہ نظام قائم رہا، امت میں کوئی اختلاف پیدا نہ ہوا۔ جب مرکزیت فنا ہو گئی تو اختلافی معاملات میں علماء نے فتوے دینے شروع کر دیئے۔ اس سے امت میں کس قدر شدید اختلافات پیدا ہو گئے، اس کا اندازہ ابن المقفع کے ایک بیان سے لگایئے جو رسالہ فکر و نظر (بابت اکتوبر ۱۹۶۶ء) میں شائع شدہ ایک مقالہ میں دیا گیا ہے۔ ابن المقفع کا انتقال ۱۴۲ھ میں ہوا تھا۔ لہٰذا، یہ کیفیت اواخر پہلی صدی اور اوائل دوسری صدی ہجری کی سمجھیے۔ وہ لکھتے ہیں:-

> کوفہ، بصرہ اور ان کے اطراف میں قتل (دماء) اور نکاح (فروج) اور مال (اموال) کے متنا قض احکام میں اختلاف انتہائی شدت اختیار کر چکا ہے۔ ایک شخص کے خون اور شرمگاہ کو حیرہ میں حلال سمجھا جاتا ہے لیکن کوفہ میں وہ حرام ہیں۔ خود کوفہ کے اندر یہ اختلاف موجود ہے۔ اسکے ایک محلہ میں جو چیز حلال ہے وہ دوسرے میں حرام ہے ..... اہل عراق اور اہل حجاز میں سے ہر فریق اپنے فقہی نظریات کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور دوسرے کا استخفاف کرتا ہے۔

اس مقالہ کے آخر میں لکھا ہے کہ "اس انتشار و فوضویت سے تنگ آکر ابن المقفع یہ رائے دیتا ہے کہ ہر شخص اپنی رائے خلیفہ کے سامنے پیش کرے اور صرف خلیفہ کو یہ اختیار ہے کہ ان میں سے جسے چاہے نافذ کرے۔ یہی اختلافات ختم کرنے کا طریق ہے اور اسی کی طرف طلوع اسلام بار بار توجہ دلاتا ہے اور علماء کرام کے حضور سے کفر کے فتوے کا مستحق قرار پاتا ہے۔ معلوم نہیں یہ رائے دینے سے ابن المقفع پر کیا بیتی ہوگی!

۲۔ اسلاف پرستی کے نتائج

ہمارے ہاں صدیوں سے یہ عقیدہ چلا آرہا ہے کہ قرآن کریم میں کئی آیات ایسی ہیں جن کا حکم منسوخ ہو چکا

ہے۔ لیکن انہیں محض تلاوت کے لئے رکھا گیا ہے۔ قرآنِ کریم میں کسی آیت کے متعلق یہ نہیں کہا گیا کہ یہ آیت فلاں آیت سے منسوخ ہے۔ اس لئے علماء کرام نے خود ہی فیصلہ کر دیا کہ فلاں آیت منسوخ ہے۔ اپنے خدا کی کتاب کے متعلق انسان یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اس میں سے فلاں فلاں حکم کو منسوخ سمجھو) ان آیات کی تعداد بڑھتے بڑھتے پانسو تک پہنچ گئی۔ علامہ سیوطی رحمۃ نے ان کی تعداد کو گھٹا کر انیس تک کر دیا۔ لیکن اس سے بھی وہ اصول تو باقی رہا کہ قرآن کی بعض آیات منسوخ ہیں۔ اس سلسلہ میں' ماہنامہ الرحیم کی اپریل ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ شاہ ولی اللہ رحمۃ نے اس باب میں کیا کیا۔ اس میں لکھا ہے کہ

> آخر شاہ صاحب نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور بڑی عمدگی سے یہ بات ثابت کر دی کہ قرآن کریم میں نسخ سرے سے ہے ہی نہیں۔ گو مصلحت وقت کا لحاظ کرتے ہوئے اپنا یہ نظریہ آپ نے فی الوقت واضح نہیں کیا۔ آپ کے سب سے بڑے شارح مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ نے آپ کے ارشادات کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بات صاف کر دی کہ آپ قرآن کریم میں نسخ کے قائل نہیں تھے۔ کیونکہ جن پانچ آیات میں آپ نسخ تسلیم کرتے ہیں اگر آپ کے طریقے کے مطابق ان کی تفسیر و تاویل کی جائے تو ان کا حل بھی کچھ ایسا دشوار نہیں۔　　(صفحہ ۴۰)

یعنی (اس مقالہ کی رو سے) بات یوں ہوئی کہ:

(۱) حضرت شاہ صاحب کا عقیدہ تو یہ تھا کہ قرآن مجید میں سرے سے نسخ ہے ہی نہیں لیکن مصلحتِ وقت سے آپ نے اپنا یہ نظریہ واضح نہ کیا۔ بلکہ پانچ آیتوں کو منسوخ بتایا۔

(۲) بعد میں مولانا سندھی نے ثابت کیا کہ وہ آیات بھی منسوخ نہیں اور شاہ صاحب نے محض مصلحتاً انہیں منسوخ قرار دے دیا تھا۔

مقالہ نگار' اس باب میں شاہ صاحب کی مدافعت میں لکھتے ہیں۔

> جن اصحاب نے شاہ صاحب کی تصانیف کا بغور مطالعہ کیا ہے وہ یہ بات اچھی طرح جان سکتے ہیں کہ شاہ صاحب دینی اور قومی مصالح کا رکھنا از بس ضروری سمجھتے تھے۔

مقالہ نگار نے ایسا کہنے سے خود شاہ صاحب کے متعلق کیا تصور پیش کیا ہے' اسے چھوڑیئے۔ ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ کیا معلوم ہمارے اسلاف نے اپنی کتابوں میں "دینی اور قومی مصالح" کی خاطر کتنا کچھ ایسا رہنے دیا ہے جسے وہ صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ ہمارے قدامت پرست طبقہ کا یہ اصرار کہ جو کچھ اسلاف فرما گئے ہیں، ہمیں اس کے پرکھنے کا حق نہیں، کتنی بڑی گمراہی کا موجب ہے۔ ہمارے پاس خدا کی کتاب موجود ہے جس کی روشنی میں ہر انسان کو حق حاصل ہے کہ جو کچھ کسی اور انسان نے کہا ہے (خواہ وہ

اس وقت موجود ہے یا جو اس سے پہلے گزر چکا ہے) اسے پرکھے۔ اگر وہ اس کتاب کے مطابق ہے تو اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے۔ اگر اس کے خلاف ہے تو مسترد کر دیا جائے۔

لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت اسے کفر وارتداد قرار دیتی ہے۔ اس کے نزدیک ؎

خطائے بزرگاں گرفتن خطا است

۳۔ کتاب و سنت کے عین مطابق

دستورِ پاکستان میں یہ بنیادی شق ہے کہ یہاں کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ اور افراد و مملکت کو اسلامی قالب میں ڈھالا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس کا سب سے پہلے اطلاق اربابِ نظم و نسق پر ہونا چاہیئے۔

اخبارات میں شائع شدہ اطلاع کے مطابق پچھلے دنوں لاہور میں داتا صاحبؒ کے مزار کو غسل دینے کی سالانہ تقریب ہوئی تو اس میں اوقاف کے چیف ایڈمنسٹریٹر صاحب بھی شریک ہوئے۔

کیا ارا کینِ حکومت میں سے کوئی صاحب بتائیں گے کہ ان صاحب کا یہ عمل قرآن کی کس آیت کے مطابق اور رسول اللہؐ کی کون سی سنت کے اتباع میں تھا۔

صدرِ مملکت آئے دن اس قسم کے اعلانات کرتے رہتے ہیں کہ جب تک ملک سے توہم پرستی کو دور نہیں کیا جائے گا، قوم ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ اور عمالِ حکومت کا یہ عالم ہے کہ توہم پرستیوں کی جو بوسیدہ عمارات خود زمانے کے تقاضوں سے مائل بہ انہدام تھیں، انہیں اپنے ہاتھوں سے از سرِ نو استوار کئے جاتے ہیں۔ کس قدر قابلِ رحم حالت ہے بیچاری اس قوم کی۔ اِسے اقامتِ دین کے علمبرداروں کو دیکھئے تو وہ لاہور کی کھڈیوں پر بنے ہوئے کپڑے کے چند ٹکڑوں کو غلافِ کعبہ کا نام دے کر ملک بھر میں اس کا جلوس نکالتے ہیں اور محض سستی شہرت حاصل کرنے کے لئے دنیا کی نگاہوں میں اسلام کو اضحوکہ بناتے ہیں۔ اور اربابِ اقتدار کو دیکھئے تو وہ مزاروں کو غسل دے کر مملکت کو اسلامی بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سچ کہا تھا کہنے والے نے ؎

کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

۴۔ مداحینِ اقبالؒ

۲۳ اپریل ۱۹۶۷ء کو حسبِ معمول 'مرکزی مجلسِ اقبال' کے زیرِ اہتمام لاہور میں یومِ اقبال کی تقریب منائی

گئی جس میں محترم اے کے بروہی صاحب نے بھی اجتماع سے خطاب فرمایا۔ خطاب کا عنوان تھا ، اقبال، اجتہاد اور اسلامی سوشلزم کا تصور ۔ خطاب کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے طبع کرا کر تقسیم کیا گیا۔ اس خطاب میں بروہی صاحب نے ' اسلامک سوشلزم کی مخالفت کرتے ہوئے فرمایا ۔

میں نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا ہے کہ " اگر کمیونزم میں خدا کا اضافہ کر دیا جائے تو یہ اسلام کے برابر ہو جاتا ہے " اگرچہ میں ٹریننگ کے لحاظ سے فلسفی ہوں لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میں اس جدلی ریاضی کی مساوات کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ اس لئے میں اس سلسلہ میں کچھ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ لیکن جو بات میں ایک اتھارٹی کے ساتھ (یعنی حتمی طور پر) کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ خدا کی ذات ایسی مکمل اور محیط کل ہے کہ اس میں کسی اضافہ کی ضرورت نہیں اور اگر آپ خدا کے ماننے والے ہیں تو کمیونزم جو یقیناً خدا کے انکار پر مبنی ہے ، آپ کو کبھی قابلِ قبول نہیں قرار دے سکتی ۔ آپ ان دونوں (کمیونزم اور خدا) کو بیک وقت ساتھ نہیں رکھ سکتے ۔ آپ کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ آپ ان دونوں میں سے کسے اختیار کرنا چاہتے ہیں ۔ اور اس فیصلہ کے بعد ہی آپ (ان میں سے کسی ایک کا) انتخاب کر سکتے ہیں ۔ " خدائی اشتراکیت " بھی اسی قسم کا مہمل تصور ہے جس قسم کے مہمل تصورات اسلامک سوشلزم یا اسلامک کیپٹلزم ہیں ۔

ہم جناب بروہی کی اطلاع کے لئے عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ " خدا اور اشتراکیت کے امتزاج کا یہ مہمل تصور " یہ مبنی بر تضاد ریاضی کی مساوات ۔ یہ جمع بین النقیضین کا ناقابلِ تسلیم اور مبنی بر جہالت نسخہ ' خود علامہ اقبال کا عطا کردہ ہے ۔ انہوں نے ۱۹۳۱ء میں ' سر فرانسس ینگ ہسبینڈ کے نام اپنے خط میں لکھا تھا ۔

BOLSHEVISM PLUS GOD IS ALMOST IDENTICAL WITH ISLAM.

اقبال بیچارے کو بھی کس کس قسم کے عقیدت مند " ملک " رہے ہیں ۔ ایک مقدس نسخ کہا تھا اس نے مرتے وقت کہ

چو رخت خویش بر بستم ازیں خاک
ہمہ گفتند ' با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر
چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

۵۔ زندہ باد!

اب سے دو تین برس اُدھر، ملک میں بچوں کے اغوا کے واقعات اس قدر عام ہو رہے تھے کہ ہر صاحب اولاد کا دل، گھر میں بیٹھے دھڑکتا رہتا تھا کہ خدا اس کے بچے کو بخیریت رکھے کسی بچے کا اغوا ہو جانا، اس کے ماں باپ اور دیگر اعزہ و اقارب پر کیا قیامت ڈھاتا ہے، اس کا اندازہ صاحب اولاد ہی لگا سکتے ہیں۔ بچہ فوت ہو جائے تو اس پر صبر کر لیا جاتا ہے، لیکن جو بچہ گم ہو جائے اُس کا صدمہ دن بدن بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اُس کی ماں اس مسلسل غم سے پاگل ہو جاتی ہے۔ باپ پیہم رونے سے اندھا ہو جاتا ہے۔

یارے غنیمت ہے کہ ایک آدھ سال سے ان واردات میں کمی ہو گئی ہے لیکن گم شدہ بچوں کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملتا تھا۔ اب صوبہ کے محکمہ پولیس نے اس مسئلہ کی طرف خاصی توجہ دی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت تک بہت سے بچے نہروں پر کھدائی وغیرہ کا کام کرنے والے ٹھیکہ داروں اور خرکاروں کے بیگار کیمپوں سے برآمد کئے گئے ہیں۔ ان بیگار کیمپوں کے جو وحشت انگیز حالات، اور ان میں پابہ زنجیر محبوس رکھے جانے والے معصوم بچوں پر بے پناہ مظالم کی جو داستانیں منکشف ہوئی ہیں وہ دل ہلا دینے والی ہیں۔ اس سلسلہ میں، ڈی۔ آئی۔ جی کمانڈر، انیس الرحمٰن عارف صاحب کا جو انٹرویو (امروز بابت ۵ مئی میں) شائع ہوا ہے، بڑا ہی لرزہ انگیز ہے۔ انہوں نے امروز کے نمائندہ کو بتایا کہ

> صوبے بھر میں ایک ہی گروہ ہے جس کے پاس بڑے بڑے ٹھیکے ہیں اور وہ مظلوم انسانوں کو اپنے چنگل میں پھنسا کر کوئی رقم خرچ کئے بغیر ان سے زبردستی مشقت لے رہا ہے۔ ان کیمپوں سے کوئی شخص فرار ہونے کی کوشش اس لئے نہیں کرتا کہ ایسے مقامات پر ان خرکاروں کی مکمل عملداری ہے جہاں نگرانی کرنے والا عملہ مزدوری کرنے والوں سے الگ ہوتا ہے اور ان ٹھیکیداروں کو اور خرکاروں کو بڑے بڑے لوگوں کی حمایت حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ ایک طویل عرصہ تک قانون کی زد میں آنے سے محفوظ رہے۔ انہوں نے کہا کہ مختلف سرکاری محکموں کے اعلیٰ افسروں کو اس بات کا ایک عرصے سے علم تھا کیوں کہ وہ آئے دن ان مقامات کا دورہ کرتے رہتے تھے۔ انہیں اس بات کی بھی خبر ہوتی تھی کہ یہاں کن افراد سے مشقت لی جا رہی ہے۔ لیکن انہوں نے کبھی بھی حکام بالا یا پولیس کو اس کی نشاندہی نہیں کی۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ تھی انہیں خود جان کا خطرہ ہوتا تھا۔

انسانیت سوز دہشت و بربریت کے یہ واقعات اور انارکی اور لاقانونیت کے یہ خون کھولا دینے والے کوائف کسی تبصرہ کے محتاج نہیں، بجز اس کے کہ یہ کچھ اس بیسویں صدی میں، ایک آئینی ملک میں ہو رہا ہے ہم اس باب میں اربابِ حکومت سے بزور گزارش کریں گے کہ

۱۔ جن انسانیت دوست افسروں نے اس ہمت سے کام لے کر ان دہشت گردوں کا سراغ لگایا ہے ان کی مناسب حوصلہ افزائی کی جائے۔ وہ ساری قوم کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

۲۔ انہیں تمام ضروری وسائل و ذرائع بہم پہنچائے جائیں جن سے وہ ملک کا کونہ کونہ چھان ماریں۔ اور جہاں جہاں ایسی وارداتیں ہو رہی ہیں، انہیں اپنی گرفت میں لے آئیں۔

۳۔ ان لرزہ انگیز جرائم کے مجرمین کو ایسی عبرت انگیز سزائیں دی جائیں جن سے ملک میں قانون کی دھاک بیٹھ جائے اور کسی کو اس قسم کی حرکت کی جرأت نہ پڑے۔ ہمارے نزدیک ان کے مقدمات کے لئے ایک خاص ٹریبونل قائم کیا جائے جسے سزائے موت تک دینے کے اختیارات حاصل ہوں۔

۴۔ ان تمام بڑے بڑے لوگوں کو برابر کا مجرم قرار دیا جائے جن کی ان مجرمین کو حمایت حاصل رہی ہے۔ اور

۵۔ ان سرکاری افسروں کو بھی ملزم قرار دیا جائے جنہوں نے، علم ہونے کے باوجود، ان مظالم کا انکشاف نہیں کیا۔

۶۔ اور سب سے زیادہ ضروری بات یہ کہ اس ضمن میں جو مزید اقدامات کئے جائیں اور ان مجرموں کے خلاف جو کارروائی کی جائے، پبلک کو اس سے پیہم آگاہ رکھا جائے۔

ہمارے ہاں عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ اس قسم کی خبریں دو چار دن تک فضا میں سنسنی پیدا کر دیتی ہیں اور اس کے بعد کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی کہ پھر ہوا کیا۔

ملک کے اخبارات سے بھی ہماری گزارش ہے کہ وہ اس اہم مسئلہ کو ہنگامی اور عارضی نہ سمجھیں بلکہ اپنی توجہات کا مستقل موضوع بنائیں۔ ملک ان کا بھی مشکر گزار ہوگا۔

پسِ تحریر: ہم یہ لکھ چکے تھے، کہ اخبارات میں شائع شدہ خبروں سے معلوم ہوا کہ حکومت نے ان لرزہ خیز واقعات کی اہمیت کے پیشِ نظر اس مسئلہ کو اپنی خصوصی توجہ کا مرکز قرار دے لیا ہے۔ اب (باقی قوم کے ساتھ) ہم منتظر رہیں گے، کہ حکومت کی مساعی کے نتائج سامنے آئیں۔ (۱۷ مئی)

بابُ المراسلات

ا۔ چند فریب اور اُنکی حقیقت

ایک صاحب لکھتے ہیں ۔۔ طلوعِ اسلام جماعت اسلامی کی ایلہ فریبیوں کی جس انداز سے نقاب کشائی کرتا ہے یہ ملک اور قوم کی بہت بڑی خدمت ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پاکستان کے لئے سب سے بڑا خطرہ یہی جماعت ہے اور اس خطرہ سے قوم کو متنبہ کرنا پاکستان کی سالمیت کے لئے نہایت ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں دو ایک باتیں وضاحت چاہتی ہیں۔ امید ہے آپ طلوعِ اسلام میں ان پر روشنی ڈالیں گے۔ آج کل جماعت اسلامی کی طرف سے عام پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ پاکستان کی تحریک کی بنیاد "دو قومی نظریہ" پر تھی۔ یہ نظریہ مودودی صاحب نے پیش کیا تھا۔ اور انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ پاکستان حاصل ہوگیا۔ اگر یہ اس نظریہ کو اس شدومد سے پیش نہ کرتے تو تحریک پاکستان کبھی کامیاب نہ ہو سکتی ......

طلوعِ اسلام ۔ آپ "پاکستان" کہہ رہے ہیں، مودودی صاحب کے مرید تو یہاں تک بھی کہہ دیں گے کہ اگر وہ (مودودی صاحب) کوشش نہ کرتے تو (معاذ اللہ) کائنات بھی وجود میں نہ آتی ۔۔ ان کا عقیدہ (یا کم از کم پراپیگنڈہ) یہ ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں کوئی اچھا خیال، یا اچھا کام دکھائی دے وہ مودودی صاحب کا رہینِ منت ہے اور جہاں کوئی خرابی پیدا ہو، اس کے ذمہ دار ان کے مخالفین ہیں۔ مودودی صاحب کے برادرِ اکبر محترم ابوالخیر مودودی صاحب نے جو کہا تھا کہ "ابوالاعلیٰ بعد از خدا بزرگ .... " ہو گئے، تو یہ ان کی اسی ذہنیت کا اظہار تھا۔

"دو قومی نظریہ" کے معنی یہ ہیں کہ اسلام میں قومیت کا مدار وطن، نسل، رنگ، زبان کا اشتراک نہیں بلکہ دین (اسلام) کا اشتراک ہے۔ لہذا ہندوستان میں بسنے والے مسلمان اپنے دین کی بنا پر وہاں کے غیر مسلموں (ہندوؤں) کے مقابلہ میں ایک الگ قوم کے افراد ہیں۔ ہندوستان میں سب سے پہلے اسکی طرف سرسید نے ۱۸۶۷ء میں اشارہ کیا تھا۔ پھر علامہ اقبال نے ۱۹۰۵ء میں اعلان کیا کہ ۔

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

مودودی صاحب کی عمر اس وقت دو سال کی تھی۔

پھر ۱۹۱۰ء کے بعد اقبال نے "وطنیت" کے عنوان سے ایک بھرپور نظم لکھی جس میں دو ٹوک الفاظ میں کہا کہ اشتراکِ وطن کی بنا پر قومیت کا نظریہ اس قدر خلافِ اسلام ہے کہ ع

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

انہوں نے اس نظریہ کو ایک بت قرار دیا اور امتِ مسلمہ سے کہا کہ

اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

اس لئے کہ — قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے — پھر انہوں نے "مذہب" کے عنوان سے ایک نظم شائع کی جس میں کہا کہ ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

یہ تو ان کی خاص خاص نظموں کا ذکر ہے، ورنہ وہ اپنے اس پیغام کو مختلف طرق و اسالیب سے مسلسل دہراتے چلے آرہے تھے ۱۹۲۱-۲۲ء میں انہوں نے مسلمانانِ عالم کو اشتراکِ دین کی بنا پر ایک قوم کا فراموش کردہ سبق یاد دلاتے ہوئے کہا کہ یاد رکھو۔

جو کر لیگا امتیازِ رنگ و بو مٹ جائے گا — ترک خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر
نسلِ اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی — اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہگذر

اور اگلے سال اس سے اور زیادہ واضح الفاظ میں کہا کہ

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی! — تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے!
تو اے مرغِ چمن اڑنے سے پہلے پر فشاں ہو جا

مودودی صاحب اس زمانے میں جمعیت العلماء (ہند) کے اخبار الجمعیۃ سے منسلک تھے جو اشتراکِ وطن کی بنا پر ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت کا بڑا متشدد علمبردار اور مبلغ تھا۔

جیسا کہ ان کے برادر اکبر نے فرمایا ہے، مودودی صاحب طبعاً، بعد از خدا بزرگ توئی قصہ کوتاہ کسی مقام پر قناعت نہیں کر سکتے۔ انکا خیال تھا کہ انہیں، الجمعیت سے وابستگی کی وجہ سے، متحدہ قومیت کے علمبرداروں میں امامت و قیادت کا منصب مل جائے گا۔ لیکن وہاں امام الہند ابوالکلام آزاد، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی اور مفتی کفایت اللہ جیسے نامور لیڈروں کی موجودگی میں ان کا یہ خواب کیسے شرمندۂ تعبیر ہو سکتا تھا۔ چنانچہ یہ وہاں سے الگ ہو گئے۔ اور جب ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبالؒ نے الہ آباد کے خطبہ میں، مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کی بنا پر، ان کی جداگانہ مملکت کا تصور محسوس شکل میں پیش کیا، تو مودودی صاحب نے اس طرف آنے کی سوچی۔ چنانچہ انہوں نے جداگانہ قومیت کے حق میں مضامین لکھے۔ اس سے لیگ (یا یوں کہیئے کہ پاکستان تحریک) کے حلقہ سے وہ متعارف ہوئے۔ اور چونکہ اس کے لئے (دکن کے مقابلہ میں) شمالی ہند کی فضا زیادہ سازگار تھی، وہ ادھر منتقل ہو آئے[1]۔ علامہ اقبالؒ چونکہ اس زمانے میں مستقلاً بیمار رہتے تھے اسلئے ان کا (مودودی صاحب کا) خیال تھا کہ اس حلقہ کی قیادت ان کے حصے میں آجائے گی۔ لیکن بدقسمتی سے یہاں جناح صاحب تشریف لے آئے۔ ان کی موجودگی میں بڑے بڑوں کا چراغ نہیں جل سکتا تھا، مودودی صاحب کس قطار و شمار میں تھے۔ اب ان کی ہوس قیادت نے انہیں ایک اور پلٹا لینے پر مجبور کیا۔ یہ داستان بھی بڑی دلچسپ ہے۔

تحریک پاکستان کی بنیاد اس دعوے پر تھی کہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمان، اشتراک دین کی بنیاد پر ایک الگ قوم ہیں اس لئے ان کی اپنی آزاد مملکت ہونی ضروری ہے۔ قائد اعظم کہا کرتے تھے کہ پاکستان کی پہلی اینٹ اس دن رکھی گئی تھی جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم اسلام لایا تھا۔ کیونکہ اس سے ایک جداگانہ قومیت کی بنیاد پڑی تھی۔ اس سے پہلے مودودی صاحب بھی اس نظریہ کی حمایت کرتے تھے لیکن جب اس نظریہ کی بنا پر قوم کی قیادت، جناح صاحب کے ہاتھ میں آگئی تو مودودی صاحب نے اس کی مخالفت شروع کر دی۔ اب ان کا انداز گفتگو یہ تھا کہ موجودہ مسلمانوں کو محض اس بنا پر الگ وحدت سمجھنا کہ وہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو گئے ہیں اور مردم شماری کے رجسٹر میں انہوں نے اپنا نام مسلمان لکھوا دیا ہے، یکسر خلاف اسلام ہے۔ جن مسلمانوں کا شعار اسلامی نہیں وہ مسلم جماعت کے افراد نہیں ہو سکتے۔ اسطرح انہوں نے مسلمان ہونے کی جہت سے ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کے دعوئے جداگانہ قومیت کی مخالفت شروع کر دی۔ اور ۱۹۳۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک اس کی برابر مخالفت کرتے رہے۔ اس دعویٰ کی بھی مخالفت، اور اس دعویٰ کی بنا پر مطالبۂ پاکستان کی بھی مخالفت۔ جو لوگ اس زمانے کی تاریخ سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ مودودی صاحب

---

[1] ہم ذاتیات پر نہیں اترنا چاہتے ورنہ اس نقل مکانی کے سلسلہ میں بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

نے اس مخالفت میں کس قدر شدت برتی تھی اور "جداگانہ قوم بننے والے مسلمانوں اور ان کے قائد" کو کس قدر گالیاں دی تھیں۔ یہ تو تھی جناح کی قیادت کے خلاف ان کے دل کی جلن، دوسری طرف اپنی قیادت کے لئے انہوں نے یہ تحریک چلائی کہ اس مسلمان کہلانے والی قوم میں سے جو لوگ حقیقی معنوں میں مسلمان بننا چاہتے ہیں، وہ آئیں اور میرے ہاتھ پر تجدید ایمان کریں۔ چنانچہ ۱۹۴۱ء میں انہوں نے اس طرح تجدید ایمان کرنے والوں کی ایک الگ جماعت بنائی اور خود ان کے قائد بن بیٹھے۔ یہ مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں سو پچاس سے زیادہ تجدید ایمان کر کے مسلمان بننے والے میسر نہ آسکے، ورنہ اگر یہ تحریک وہاں زیادہ پھیل جاتی تو آپ سوچئے کہ وہاں مسلمانوں کی کیفیت کیا ہوتی۔ یعنی

(۱) وہ، اسلامی نظریۂ قومیت کی بنا پر، ہندوؤں سے کٹ کر، ایک جداگانہ قوم کے افراد بن چکنے کے مدعی تھے، لہٰذا، وہ ہندی قوم کے افراد نہیں رہے تھے۔

(۲) دوسری طرف، مودودی صاحب انہیں مسلم قوم کے افراد نہیں سمجھتے تھے۔ مسلم قوم کے افراد وہ تھے جو مودودی صاحب کو اپنا امام تسلیم کرتے تھے۔ مودودی صاحب کا ارشاد یہ تھا کہ اگر ان پیدائشی مسلمانوں کو پاکستان مل بھی گیا تو وہاں جمہوریت کی رُو سے (اُس جمہوریت کی رُو سے جسے یہ اب عین اسلام قرار دے رہے ہیں) جو حکومت قائم ہوگی وہ ہندوؤں کی حکومت سے بھی زیادہ "کافرانہ" ہوگی۔

لیکن ان کی اس قدر شدید مخالفت کے باوجود پاکستان قائم ہوگیا اور یہ اسی کافرانہ حکومت کے زیرِ سایہ پناہ لینے کے لئے ادھر منتقل ہوگئے۔ یہاں پھر وہی ہوسِ قیادت انہیں چین نہیں لینے دیتی۔ اب ان حضرات کی ٹیکنیک یہ ہے کہ مودودی صاحب نے جو مضامین متحدہ قومیت کے خلاف لکھے تھے انہیں بڑھا چڑھا کر پیش کر کے یہ ڈھنڈورا پیٹا جائے کہ دیکھئے! مودودی صاحب کس قدر پاکستان کے حامی تھے۔ اس کے لئے ان کے پاس اُن کے امیر کا یہ فتوےٰ موجود ہے کہ۔

> راست بازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے۔ اور جھوٹ اس کی نگاہ میں بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتوےٰ دیا گیا ہے۔
>
> (ترجمان القرآن۔ بابت مئی ۱۹۵۸ء)

۲۔ جمہوریت

یہی صاحب دوسرا سوال یہ دریافت فرماتے ہیں کہ جماعت اسلامی بڑی شدومد سے جمہوریت کو اسلامی قرار دے کر اس کے حق میں پراپیگنڈہ کرتی ہے۔ ان کا یہ دعوےٰ کہاں تک حق پر مبنی ہے۔

طلوعِ اسلام

کچھ عرصہ ہوا ہم نے طلوعِ اسلام میں ایک تفصیلی مقالہ شائع کیا تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ اس سے پہلے مودودی صاحب اس جمہوریت کو (جسے وہ اب عین اسلام قرار دے رہے ہیں) کس طرح کافرانہ نظام قرار دیا کرتے تھے۔ یہ مقالہ طلوعِ اسلام کی جنوری ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ لیکن اس زمانے کے مقابلہ میں اب قارئین طلوعِ اسلام کا حلقہ کہیں زیادہ وسیع ہو چکا ہے اس لئے نووارداںِ محفل کی نظروں سے وہ مقالہ نہیں گزرا ہوگا۔ ہم عندالضرورت اس موضوع پر تفصیلاً دوبارہ لکھیں گے۔ اس وقت صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ (اپنی موجودہ کروٹ بدلنے سے پہلے) مودودی صاحب نے لکھا تھا کہ

> جمہوری انتخاب کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے دودھ کو بلو کر مکھن نکالا جاتا ہے اگر دودھ زہریلا ہوگا تو اس سے جو مکھن نکلے گا، قدرتی بات ہے کہ وہ دودھ سے زیادہ زہریلا ہوگا۔ اسی طرح اگر سوسائٹی بگڑی ہوئی ہو تو اس کے ووٹوں سے وہی لوگ منتخب ہو کر برسرِاقتدار آئیں گے جو اس سوسائٹی کی خواہشاتِ نفس سے سندِ قبولیت حاصل کر سکیں گے۔ پس جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت اپنی قائم ہو جائے گی ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔
>
> (ترجمان القرآن، بابت محرم ۱۳۶۰ھ، ص ۲۹)

اس وقت بھی وہی قوم ہے جو اس زمانے میں تھی۔ بلکہ یہ حضرات خود اس کا رونا روتے ہیں کہ قوم کی اخلاقی حالت پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو گئی ہے لیکن اب اس دودھ سے جو مکھن نکلے گا وہ زہر نہیں تریاق ہوگا — بشرطیکہ بلونی مودودی صاحب کے ہاتھ میں ہو۔

یہ حضرات یہ کہہ کر دھوکا دیتے ہیں کہ ہم یہاں "اسلامی جمہوریت" قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اول تو انہوں نے

آج تک یہ نہیں بتایا کہ وہ "اسلامی جمہوریت" ہے کیا جسے یہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی طرف سے اس وقت تک جو مطالبہ پیش کیا جاتا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ صدارتی نظام غیر اسلامی ہے اور پارلیمانی نظام اسلامی ہوگا، بنیادی جمہوریت کے ممبروں کے ووٹ سے صدر کا انتخاب غیر اسلامی ہے اور براہِ راست صدر کا انتخاب اسلامی ہوگا۔ ان سے کوئی پوچھے کہ جس زہریلے دودھ سے دہی جما کر نکالا ہوا مکھن زہریلا ہوگا، اسی دودھ سے براہِ راست کریم سے بنایا ہوا مکھن کس طرح تریاق (فلہٰذا اسلامی) ہو جائے گا؟

لیکن یہ دیکھنے کے لئے کہ جمہوری نظام سے ان کی مراد کیا ہے، ہمیں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں مودودی صاحب نے سابقہ الیکشن میں فرمایا تھا کہ

> اگر ایک ہندو جمہوری نظام کی حمایت کرتا ہے تو اُسے میری تائید حاصل ہوگی اس لئے کہ اس نے یہ اصول تسلیم کر لیا کہ ملک کا نظام اکثریت کے نظریہ کے مطابق ہونا چاہیئے۔ (بحوالہ امروز - ۲۰ اگست ۱۹۶۳ء)

یعنی ان کے نزدیک جمہوری نظام وہ ہے جسے ملک کی اکثریت کی تائید حاصل ہو۔ ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ ملک کے نمائندوں پر مشتمل پارلیمان کی اکثریت جو قانون بھی پاس کر دے گی، کیا وہ قانون اسلامی تصور کیا جائے گا؟ ان سے کہیئے کہ آپ ذرا متعین طور پر بتایئے کہ آپ جس جمہوری نظام کے قیام کے لئے کوشاں ہیں، وہ نظام ہے کیا؟

لیکن یہ کبھی متعین طور پر نہیں بتائیں گے ــــ متعین بات کرنے سے دھوکا دینے کی گنجائش نہیں رہتی۔

ممکن ہے یہ کہہ دیا جائے کہ دستورِ پاکستان میں یہ شق موجود ہے کہ پاکستان میں کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ اس لئے اکثریت کا پاس کردہ وہی قانون قابلِ قبول ہوگا جو کتاب و سنت کے مطابق ہوگا۔ اگر یہی بات ہے تو اس میں اکثریت کی شرط کی کیا ضرورت ہے؟ اگر اقلیت کا پاس کردہ قانون کتاب و سنت کے مطابق ہو تو کیا وہ قابلِ قبول نہیں ہوگا؟ اور کیا یہ ضرور ہے کہ ایک ہندو ہر اُس قانون کی تائید کرے جو کتاب و سنت کے مطابق ہو؟ پھر کسی ہندو کا آپ کے تصور کی جمہوریت کی تائید کرنے سے کیا مطلب ہوا؟

غور فرمایئے! یہ لوگ، عوام کو کس طرح بھول بھلیوں میں مبتلا رکھتے ہیں! لیکن کچھ ان سے نہیں ــــ کچھ تو اُن سے ہے جو سب کچھ دیکھتے بھالتے، ان کے فریب میں آجاتے ہیں۔ اور انہیں اسلامی نظام کا سب سے بڑا علمبردار خیال کرتے ہیں۔

ایک قدیم مسیحی فرقے کے عقائد

قرآن کریم نے کہا تھا کہ جوں جوں فطرت کے سربستہ رموز کھلتے جائیں گے وہ قرآنی دعاوی کی صداقت کا ثبوت بنتے چلے جائیں گے۔ یہ وجہ ہے کہ اسلام، ہر سائنٹفک تحقیق اور تاریخی انکشافات کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتا ہے۔

موجودہ عیسائیت کی ساری عمارت کی بنیاد حضرت مسیح کی الوہیت و ابنیت اور تصلیب کے عقائد پر استوار ہے۔ یعنی ان کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا خود زمین پر آیا یا اس نے اپنے بیٹے کو بھیجا تاکہ وہ صلیب پر جان دے کر گنہگاروں کے گناہوں کا کفارہ بن جائے۔ قرآن کریم نے ان دونوں عقاید کی تردید کی اور کہا کہ حضرت عیسٰے خدا کے ایک برگزیدہ رسول تھے، نہ کہ خدا یا خدا کے بیٹے۔ اور وہ صلیب پر چڑھائے ہی نہیں گئے ۔۔۔ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (۴/۱۵۷) "انہوں نے نہ تو اسے (حضرت مسیح کو) قتل کیا اور نہ ہی سولی پر چڑھا کر ہلاک کیا۔ بلکہ ان پر اصل حقیقت مشتبہ ہو گئی" ۔ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ - (انہیں اس باب میں سخت اشتباہ ہو گیا) بہت بڑا دعوے تھا جسے نہ یہودی صحیح تسلیم کرتے تھے نہ عیسائی۔ اس "اشتباہ" کی تشریح کرتے ہوئے، پرویز صاحب نے اپنی کتاب "شعلہ مستور" میں لکھا تھا۔

> معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہودیوں کی سازش کا علم ہو جانے کے بعد حضرت عیسٰے بحکم خداوندی کسی اور مقام کی طرف تشریف لے گئے۔ (آپ کی گرفتاری کے متعلق) اصل صورت حال یوں دکھائی دیتی ہے کہ آپ کے حواریوں کو معلوم تھا کہ حضرت عیسٰے تشریف لیجا چکے ہیں اور جس شخص کو گرفتار کیا جا رہا ہے، کوئی اور ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فدائیوں کی اس جماعت نے باہمی مشورہ سے خود اپنے میں سے ایک سچے جانباز کو تیار کر رکھا ہو کہ وہ حضرت مسیح کا بھیس بدل کر اپنے آپ کو یہود کی سراغ دہی کے بعد (جو خود اس تدبیر کا ایک جزو ہو سکتی ہے) گرفتا

کرا دے تاکہ دشمن حضرت مسیحؑ کی تلاش میں سعی و کاوش نہ کریں۔ (ص ۵۴)

لیکن عیسائی اسے کس طرح صحیح تسلیم کرسکتے تھے، اس لئے کہ اس سے ان کی بنیادی تعلیم کی عمارت نیچے آگرتی تھی۔ لیکن اب (حال ہی میں) مسیحی علماء کو استنبول سے ایک مخطوطہ ملا ہے جس میں عیسائیوں کے ایک اولین فرقہ کے عقاید کا ذکر ہے۔ یہ فرقہ نصاریٰ یا نصرانی (NAZARENES) کہلاتا تھا، اور حضرت مسیحؑ کے حواریوں کا سب سے پہلا جانشین تھا۔ ان کے عقاید یہ تھے کہ حضرت مسیحؑ خدا یا خدا کے بیٹے نہیں تھے بلکہ ایک برگزیدہ رسول تھے۔ اور یہ کہ وہ صلیب کے واقعہ سے پہلے ہی کہیں اور جا چکے تھے۔ اس فرقہ کے لوگوں کو بعد میں دوسرے عیسائیوں نے تنگ کرکے ترکِ وطن پر مجبور کر دیا تھا اور اس طرح وہ فلسطین چھوڑ کر گئے تھے۔ اس مخطوطہ کی پوری تفصیل امریکہ سے شائع ہونے والے ہفتہ وار رسالہ ٹائمز (TIMES) کی ۱۵ جولائی ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں شائع ہوئی ہے جس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔ امید ہے کہ قارئین اسے مفید پائیں گے۔ (طلوعِ اسلام)

"عیسائیوں کا موجودہ عقیدہ یہ ہے کہ (حضرت) مسیحؑ خدا کے بیٹے تھے۔ لیکن کلیسا کے مورخین کو ایک عرصے سے اس حقیقت کا علم ہے کہ آپؑ کے بہت سے یہودی متبعین، جو آپ کی وفات کے تھوڑا عرصہ بعد تاریخ کے صفحات پر ہمارے سامنے آتے ہیں، آپ کو صرف انبیائے بنی اسرائیل میں سے ایک نبی تسلیم کرتے تھے۔ اور وہ سینٹ پال اور سینٹ پطرس کے اس بنا پر سخت مخالف تھے کہ انہوں نے مسیحؑ کی تعلیم کی تبلیغ غیر بنی اسرائیل میں بھی کی۔ حال ہی میں ایک ایسا انکشاف ہوا ہے جس سے اس قسم کے متبعین حضرت عیسےٰؑ کے ایک فرقے کے حالات معلوم ہوتے ہیں جنہیں نصرانی کہا جاتا تھا۔ یہ انکشاف ایک قدیم عربی مخطوطہ کی رو سے ہوا ہے جو استنبول سے ملا ہے۔ یروشلم کی عبرانی یونیورسٹی کے سکالر ڈیوڈ فلسر (DAVID FLUSSER) نے — جو کلیسا کے دورِ اول کے علماء تاریخ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں — کہا ہے کہ اس مخطوطہ کی اہمیت اس بنا پر بہت زیادہ ہے کہ اس سے عیسائیت کے ایک اولین فرقہ کے احوال و کوائف پر اسی طرح (پہلے پہل) روشنی پڑی ہے جس طرح بحیرہ مردار سے دریافت شدہ مخطوطات سے زمانہ قبل از عیسائیت کے پس منظر پر روشنی پڑی تھی۔

یہ مخطوطہ جو قریب چھ سو صفحات پر مشتمل ہے، دسویں صدی کے ایک مسلمان عالم، عبد الجبار کا تحریر شدہ ہے۔ اس میں ایک سو چالیس صفحات پر مشتمل، ایک قدیم شامی کتاب کا عربی ترجمہ ہے جو قریب پانچویں صدی میں، خود اس فرقہ کے افراد نے لکھی تھی جس کے عقاید و احوال اس میں درج ہیں۔ اس نصرانی فرقہ کو قریب ۶۲ء میں عیسائیت کے دیگر فرقوں کے افراد نے فلسطین سے شام کی طرف

دھکیل دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس فرقہ کے عقاید، دوسرے عیسائیوں سے مختلف تھے۔ اس فرقہ کا دعوےٰ یہ تھا کہ یہ حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کے سچے جانشین ہیں۔ ان عقاید کی بنا پر، دوسرے فرقے، ان سے سخت دشمنی رکھتے تھے۔

یہ مخطوطہ آکسفورڈ کے ایک عالم، ڈاکٹر سیموئیل سٹرن (SAMUEL STERN) نے دریافت کیا تھا۔ اس نے ضمناً اس کا ذکر عبرانی یونیورسٹی کے فلاسفر پائنز (SHOLMO PINES) سے کیا۔ پائنز عیسائیت کے صدر اول کی تاریخ کا ماہر ہے۔ اس مخطوطہ کے مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ اس میں قدیم نصرانی فرقہ کے عقائد بالکل صحیح رنگ میں سامنے آئے ہیں۔ اس سے پہلے ان کے متعلق صرف ان علمائے مسیحیت کے بیانات ملتے تھے، جنہوں نے انہیں مرتد قرار دے کر خارج البلد کیا تھا۔ اس فرقہ کے متعلق جو کچھ عبدالجبار نے لکھا ہے وہ ان مسیحی علماء کے بیانات سے یکسر مختلف ہے۔ ان مسیحی علماء میں سے جیروم کا دعوےٰ یہ تھا کہ یہ فرقہ بھی (دیگر مسیحی فرقوں کی طرح) الوہیت حضرت عیسیٰؑ کا قائل تھا۔ لیکن اس کتاب کے بیان کے مطابق، ان نصرانیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت مسیحؑ یوسفؑ کے بیٹے تھے اور خود ان کی دفات اور جذبات اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ وہ ایک عظیم نبی اور مردِ صالح تھے۔ اور بس ـــ اس بنا پر کہ، حضرت مسیحؑ، خود شریعت موسوی کے پابند تھے۔ اس نصرانی فرقہ کے افراد ختنہ کرانے تھے اور حرام و حلال کی ویسی ہی تمیز رکھتے تھے[1]۔ یہ اپنی عبادت کے وقت یروشلم کی طرف رُخ کرتے تھے اور سبت (چھٹی کا دن) اتوار کے بجائے ہفتہ کو مناتے تھے۔ وہ کرسمس کی تقریب نہیں مناتے تھے، کیونکہ وہ اُسے بدعت اور مشرکانہ رسم قرار دیتے تھے۔

اس کتاب میں سینٹ پال کے خلاف سخت اعتراضات کئے گئے ہیں۔ اور کہا گیا ہے کہ اس نے حضرت مسیحؑ کی اصلی تعلیم کی جگہ رومیوں کے رسوم و مناسک کو دینِ مسیحی بنا دیا۔ اور حضرت مسیحؑ کی الوہیت کا باطل عقیدہ وضع کر دیا۔ اس میں بعض مقامات تو ایسے ہیں جو انجیل سے ملتے جلتے ہیں لیکن اکثر اقوال ایسے بھی ہیں جو حضرت مسیحؑ، کی طرف منسوب ہیں لیکن جن سے مسیحی دُنیا قطعاً بے خبر ہے مثلاً یہ قول کہ:-

میں لوگوں کا حساب لینے والا اور ان کا فیصلہ کرنے والا نہیں۔ یہ کچھ وہی کرے گا جس نے مجھے بھیجا ہے۔

---

[1] واضح ہے کہ شریعت موسوی میں خنزیر کا گوشت حرام تھا اور حضرت عیسیٰؑ بھی اس کی پابندی کرتے تھے۔

علاوہ ازیں، اس مخطوطہ میں یہ بھی درج ہے کہ یہوداہ نے یہودیوں کو دھوکا دے کر حضرت مسیح کی جگہ ایک اور ہی آدمی کو ان کے حوالے کر دیا۔ اس گرفتار نے ہیروڈ اور پائیلٹ کے سامنے اپنے مسیح ہونے کا صاف انکار کر دیا۔ اس پر ہیروڈ نے (نہ کہ پائیلٹ نے، جیسا کہ اناجیل کا بیان ہے) پانی کا ایک برتن لیا اور اس میں اپنے ہاتھ دھو کر اس کا گویا اعلان کیا کہ وہ اس ملزم کے خون سے بری الذمہ ہے کیونکہ وہ اسے مجرم سمجھتا ہی نہیں۔

پھر ہیروڈ نے اس مصنوعی مسیح کو رات بھر کے لئے قید خانہ میں بھیج دیا۔ دوسری صبح غضبناک یہودیوں نے اسے پکڑ لیا اور سخت اذیت دے کر صلیب پر چڑھا دیا۔

بعض مسیحی علماء کا اس سے پہلے بھی یہ خیال تھا کہ یہ نصرانی فرقہ اقلیت میں نہیں تھا، بلکہ قرنِ اوّل کے حضرت مسیح کے متبعین کی اکثریت آپ کی الوہیت کے عقیدہ کی قائل نہیں تھی۔ یروشلم کے علمائے انجیل نے ابھی اس مخطوطہ کا تنقیدی مطالعہ نہیں کیا۔ بایں ہمہ وہ اس کی اہمیت کے قائل ہیں۔ لیکن وہ فلسر کے اس قول سے متفق نہیں کہ "ہمیں حقیقی عیسائیت کے متعلق اپنے خیالات میں تبدیلی کرنی پڑیگی" وہ یہی کہتے ہیں کہ یہ صرف اس چھوٹے سے فرقہ کے معتقدات تھے جو عیسائیت سے مرتد ہو گیا تھا اور جس کا تاریخ میں اب کوئی سراغ نہیں ملتا۔"

ارباب کلیسا کا یہ رویہ کیا نتائج پیدا کر رہا ہے، اس کا اندازہ اس ایک شذرہ سے لگائیے جو جریدہ ٹائمز کی ۱۱ر نومبر ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ پائیک (PIKE) کیلیفورنیا کا بشپ ہے۔ ایک جید عالم اور بجید معزز پادری۔ وہ عمر بھر انجیل کا مطالعہ اور تبلیغ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ عیسائیت کے اس قسم کے عقاید کہ ہر بچہ اپنے اولین ماں باپ کے گناہوں کا بوجھ ساتھ لئے پیدا ہوتا ہے۔ حضرت مسیح کی پیدائش بن باپ کے ہوئی تھی یا آپ آسمان پر تشریف لیجا چکے ہیں، نیز تثلیث کا عقیدہ، سب باطل عقاید ہیں۔ اس نے اپنے ان خیالات کا اظہار برملا کیا ہے۔ اس پر (جیسا کہ ظاہر ہے) چرچ کی طرف سے اس پر ارتداد و الحاد کے فتاویٰ صادر کئے گئے۔ لیکن انہی میں سے ایک خاصہ معتد بہ طبقہ بشپ پائیک کا ہمنوا ہو گیا۔ اب اس آواز نے وہاں ایک تحریک کی سی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس سے جب کہا گیا کہ تمہاری اس روش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ چرچ کو چھوڑ جائیں گے تو اس نے کہا کہ تم اپنی ضد میں سمجھتے نہیں ہو کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ میری خواہش اور کوشش یہ ہے کہ جتنے لوگ اس وقت چرچ سے متمسک ہیں کم از کم یہ تو اس کے ساتھ رہیں۔ اگر تم اپنے توہم پرستانہ عقاید پر قائم رہے تو یہ لوگ بھی تمہارا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔

یہ ٹھیک ہے۔ علم و عقل کے سامنے خدا کا دین ہی ٹھہر سکتا ہے۔ انسانی خیالات کا تراشیدہ مذہب (خواہ وہ کوئی ہو) اس کا مقابلہ کر نہیں سکتا۔

رابطۂ باہمی

بزمِ لاہور

۲۳ر اپریل کی شام، وائی ایم سی اے ہال میں، یومِ اقبال، نہایت تزک و احتشام سے منایا گیا۔ جلسہ گاہ سامعین سے اس قدر پُر تھی کہ شائقین کی کثیر تعداد کو بمشکل گیلری میں کھڑے ہونے کی جگہ مل سکی۔ اور کم و بیش دو گھنٹہ تک تمام مجمع پر ایک وجد آور کیفیت طاری رہی۔ پرویز صاحب کے خطاب کا عنوان تھا ــ "اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری" ــ اس ہمہ گیر خطاب کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کا ٹیپ شدہ ریکارڈ بزمہائے طلوعِ اسلام کے لئے محفوظ کر لیا گیا ہے۔ اور اسے ایک مبسوط مقالہ کی صورت میں حالیہ شمارہ میں پیش کیا جا رہا ہے۔

بزمِ لاہور کی سرگرمیاں تحریک کے سلسلہ میں بدستور جاری ہیں۔

بزمِ کراچی

بزم کے زیرِ اہتمام سندھ اسمبلی ہال میں ہفتہ وار مسلسل درسِ قرآن (بذریعہ ٹیپ) سورۂ محمدؐ تک پہنچ چکا ہے۔ ۷ر مئی بروز اتوار اسی ہال میں یومِ اقبال بڑے اہتمام سے منایا گیا۔ اور پرویز صاحب کے خطاب ــ "اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری" ــ کو بذریعہ ٹیپ سنایا گیا۔ جسے سامعین نے نہایت توجہ اور انہماک سے سُنا۔ بزم کی تازہ سرگرمیاں باوجود حالات کی نامساعدت کے جن پر اس کے جواں ہمت نمائندہ محمد اسلام صاحب اور ان کے رفقاء قابو پانے کے لئے مؤثر جدوجہد کر رہے ہیں، بڑی حوصلہ افزا اور نتیجہ خیز ہیں۔

بزمِ راولپنڈی

محترم عزیز احمد قریشی صاحب جو عرصہ سے بزم کے نمائندہ درویشِ رواں ہیں اپنے حلقۂ اثر میں تحریک کے لٹریچر اور مشن کو کامیاب بنانے کے لئے انہماک سے تگ و دو کر رہے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ بزم کے ارکان کے انفرادی کردار کی اہمیت پر بھی زور دے رہے ہیں۔ حال ہی میں ایک سب کمیٹی کی تشکیل سے یہ جائزہ لینے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ ارکانِ بزم کس حد تک

اپنی زندگی کو قرآنی احکام و قوانین کے مطابق ڈھال رہے ہیں۔

۱۳/اپریل کو پرویز صاحب کے مختصر دورۂ راولپنڈی کے دوران درسگاہ "الکوثر" (مری روڈ) میں بزم کے ارکان نے مفکرِ قرآن کا خیر مقدم کیا۔ اور انہوں نے عصرانہ کے دوران میں احباب کے کئی ایک سوالات کے جواب، اپنی روایتی بصیرت اور شگفتگی سے دیئے۔

بزمِ چنیوٹ بزم کی تشکیلِ نو کے سلسلے میں حوصلہ افزا رپورٹیں آ رہی ہیں۔ حال ہی میں مستری کریم بخش صاحب نمائندہ منتخب ہوتے ہیں۔ ارکانِ بزم تحریک اور اس کے لٹریچر کو متعارف کرانے کے لئے تندہی سے کوشاں ہیں۔ بزم کے لئے باقاعدہ دفتر اور لائبریری قائم کرنے کی تگ و دو کی جا رہی ہے طلوعِ اسلام کو زیادہ مقبول بنانے کی جد و جہد کا نتیجہ حوصلہ افزا ہے۔

بزمِ کوئٹہ ان کی طرف سے حال ہی میں ایک رپورٹ موصول ہوئی ہے۔ سردیوں میں یوں بھی کوئٹہ میں زندگی ذرا سست ہو جاتی ہے۔ موسم کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ کام حسبِ معمول شروع ہو گیا ہے اور اب ہفتہ وار اجتماعات باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ ٹیپ درس کا سلسلہ جاری ہے بعض اوقات احباب کو ان کی رہائش گاہ پر بھی ٹیپ درس سنائے جاتے ہیں۔ رسالے مناسب ہاتھوں میں پہنچ رہے ہیں اور اپنا اثر پیدا کر رہے ہیں۔ اسکولوں کے کئی ایک اساتذہ بھی اس سلسلے میں موانعات کے باوجود مفید اور مؤثر کام کر رہے ہیں۔

دیگر بزمیں دیگر بزمیں بھی اپنے اپنے حلقہ میں قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کا فریضہ تن دہی سے ادا کر رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کی ہمتوں میں برکت عطا فرمادے۔

ساہیوال چوہدری عطاء اللہ صاحب (سیکرٹری مارکٹنگ کمیٹی) کی دعوت پر پرویز صاحب محترم شیخ سراج الحق صاحب کی معیت میں، ایک روزہ دورہ پر ۱۶/مئی کو ساہیوال تشریف لے گئے۔ قریب ۱۲ بجے انہوں نے وکلا حضرات سے بار روم میں خطاب فرمایا۔ عنوان تھا "اسلام کا معاشی نظام" جسے بڑی دلچسپی سے سنا گیا۔ ۸ بجے شب فکر و ادب ہال میں زیرِ صدارت محترم رانا عبد الحمید صاحب علامہ اقبال کی یاد میں پبلک جلسہ منعقد ہوا خطاب کا عنوان تھا "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ"۔ دس بجے شب تک یہ سحر آفریں خطاب نہایت حلاوت اور انہماک سے سنا گیا۔ اداره، محترم چوہدری صاحب اور محترم ڈاکٹر عبد القادر خان صاحب کی خدمت میں جنکے ہاں پرویز صاحب قیام پذیر ہوئے، ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہے۔

نقد و نظر

"پاک فضائیہ کے شاہین" ــــــــ قیمت - /۶ روپے

پاکستان نے بھارتی جارحیت کو جس جانبازانہ عزیمت سے پسپا کیا، وہ ایک ولولہ انگیز داستان ہے اس کا اعتراف غیروں کو بھی ہے۔ اہلِ پاکستان نے اس داستان کو بیان کرنے میں یوں تو ایسی عجلت سے کام لیا کہ جنگ کے دوران ہی کتابیں چھپنا شروع ہو گئیں۔ لیکن جو کچھ لکھا گیا، اس میں سے بیشتر اس معیار پر پورا نہیں اُترا جو اس تاریخی موضوع کا متقاضی تھا۔ اب بس غنیمت ہے کہ اس کوتاہی یا زیادتی کی تلافی ہونے لگی ہے۔ اس کے آثار اس کتاب میں دکھائی دیتے ہیں جو حال ہی میں ادارہ "سیارہ ڈائجسٹ" نے شائع کی ہے اور جس کا عنوان ہے ــــ

"پاک فضائیہ کے شاہین" *

"پاک فضائیہ کے شاہین" ـــ انگریزی میں (STORY OF P.A.F. HEROES) کے نام سے لکھی گئی ہے جس کے مصنف پاک فضائیہ کے سکواڈرن لیڈر محمد افضل ہیں۔ ان ہی واقعات کو عنایت اللہ صاحب نے اردو میں منتقل کیا ہے (وہی عنایت اللہ صاحب جو حلقہ طلوع اسلام میں "دھڑکتے ہوئے انسان" کے مصنف کی حیثیت سے متعارف ہیں) لیکن یہ کتاب ترجمہ نہیں، بلکہ عنایت اللہ کا اپنا مخصوص رنگ اور ذاتی مشاہدہ ہے۔ اردو کتاب میں ایک باب کا اضافہ کیا گیا ہے جو خصوصیت سے معلومات افزا بھی ہے اور ولولہ انگیز بھی۔ اس باب کا عنوان ہے۔

"پاک فضائیہ کیسے بنی؟ کس نے بنائی؟ اور گراؤنڈ کریو (GOUND CREW)"

یہ کتاب پاک فضائیہ کے جری شاہینوں کے چیدہ چیدہ فضائی معرکوں کی تفصیلی روئیداد ہے۔ جس میں پٹھان کوٹ، انبالہ، ہلواڑہ اور آدم پور کے ہوائی اڈوں پر کامیاب حملوں کا تذکرہ شامل ہے۔ امرتسر کے ریڈار اور گورداسپور کے اسٹیشن پر گولہ بارود سے بھری ہوئی مال گاڑی کی

تباہی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ اس کتاب کے متعلق بجا طور پر دعوے کیا گیا ہے کہ یہ " واحد مستند روئیداد ہے۔ جنگ میں مصلحت کی بنا پر غلط دعوے بھی کئے جاتے ہیں — اور کسے یاد نہیں کہ " آکاش وانی " نے اس سلسلے میں کیا کیا گل نہیں کھلائے تھے۔ لیکن یہ پاکستان کا دل گردہ تھا کہ اُس نے بے بنیاد جھوٹ بولنا تو درکنار، مبالغہ آرائی تک سے کام نہ لیا۔ فضائیہ کے معاملے میں پاکستان کی حق پسندی کا کڑا امتحان تھا۔ کیونکہ طیاروں کی کارکردگی کی شہادت خودکار کیمرے دیتے ہیں جو مشین گنوں اور راکٹوں کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ یہ کیمرے رات کے وقت صحیح عکاسی کرنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ کئی فضائی کارنامے رات ہی کو سرانجام دیئے گئے۔ لیکن کیمروں کی شہادت کے فقدان کی وجہ سے کوئی دعوے نہیں کیا گیا۔

" پاک فضائیہ کے شاہین " میں اس احتیاط سے کام لیا گیا ہے اور بیان کو کیمروں کی شہادت تک محدود رکھا گیا ہے۔ یا اُن شاہبازوں کی شہادت پر انحصار کیا گیا ہے جو ان معرکوں میں شریک ہوئے۔ بعض واقعات خود ان ہی شاہبازوں کی زبان میں بیان کئے گئے ہیں جس سے کتاب کا اندازِ بیان حقیقت پسندانہ ہو گیا ہے۔

فضائی معرکے بہت سی قوموں نے لڑے ہیں لیکن پاکستان کے معرکے کسی اور ہی دنیا کی بات معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارے شاہین اُن قاعدوں کی حدود سے کہیں آگے نکل گئے جو دوسری اقوام کے ہوابازوں نے مرتب کئے تھے۔ اپنے جذبۂ یقین اور جوشِ عمل سے ہمارے فضائی غازیوں نے شجاعت اور ایثار کے وہ معیار قائم کر دیئے ہیں، جن تک دوسری قومیں آسانی سے نہ پہنچ سکی ہیں نہ پہنچ سکیں گی۔

یہ کتاب پڑھنے بلکہ پڑھتے رہنے اور محفوظ رکھنے کے قابل ہے۔ ایسی کتابیں نئی نسل کے بچے بچے کے پاس ہونی چاہئیں — یہ ہماری قوم کے جذبۂ حیرت کی تاریخ ہے۔

کتاب بڑے سائز ۱۷½×۲۷ پر اچھے دبیز کاغذ پر آفسٹ پر چھاپی گئی ہے۔ طباعت تو بہت اچھی ہے البتہ کتابت کمزور رہ گئی ہے۔ جلد بھی اس سے بہتر ہونی چاہیئے تھی۔ کتاب میں کم و بیش ساٹھ (۶۰) تصویریں دی گئی ہیں۔ ان دلکش خوبیوں اور مواد کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے کتاب کی قیمت چھ روپے زیادہ نہیں۔

ملنے کا پتہ:۔ سیارہ ڈائجسٹ پبلیکیشنز۔ کوئنز روڈ۔ لاہور

Regd. L. No. 7243
MONTHLY TOLU-E-ISLAM LAHORE

ادارہ طلوعِ اسلام کی انقلاب آفریں پیشکش

سلسبیل

قرآنی فکر کا چشمۂ رواں — قرآنی بصیرت کی جوئے شیر

یعنی

مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب کے انقلاب انگیز مضامین کا دوسرا مجموعہ

قرآن کریم کی حیات بخش تعلیم - پرویز کا حسینِ اندازِ بیان - اور

ادارہ کی پیشکش —— تینوں یکجا -

کتابت طباعت دیدہ زیب - کاغذ وھائٹ پرنٹنگ - جلد عمدہ - گردپوش جاذبِ نگاہ -

ضخامت —— ساڑھے تین سو صفحات

قیمت —— مجلد آٹھ روپے

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

[illegible] کتابیں

لغات القرآن — قرآن کریم کے [illegible] الفاظ [illegible] معنی [illegible]
انداز میں [illegible] چار جلدوں کی قیمت پچاس روپے پہلا ایڈیشن [illegible] کی [illegible]

اسلام کیا ہے — [illegible] دین کے بنیادی تصورات کا نہایت حسین اور دلکش [illegible] قسم اعلیٰ (آٹھ روپے) [illegible] ایڈیشن چار روپے

قرآنی فیصلے — [illegible] مسائل اور معاشرہ کے معاملات کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔ بڑی معلومات افزا کتاب
جلد اوّل (تین روپے پچیس پیسے) جلد دوم (تین روپے پچیس پیسے) جلد سوم (تین روپے)

سلیم کے نام خطوط — ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں ان کا
کا نہایت سادہ اور دلکش [illegible] انداز میں جواب۔ مذہب گزیدہ نوجوانوں کو اسلام کی طرف لانے کے لئے بڑی کامیاب کوشش ہے۔
جلد اوّل [illegible] روپے جلد دوم (چھ روپے) جلد سوم (چھ روپے)

انسان نے کیا سوچا — افلاطون سے لیکر اس وقت تک کے مختلف مفکرین۔ مورخین اور سائنسدانوں نے زندگی کے مسائل کے
متعلق کیا کہا ہے۔ کیا وہ انسانی دنیا کی گتھیاں سلجھا سکے ہیں؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے بے نیاز کر دے گی۔ قیمت۔ بارہ روپے

نظامِ ربوبیت — انسانی زندگی کا پہلا مسئلہ روٹی کپڑے کا ہے کیا یورپ یا روس کا نظام اس مسئلہ کا اطمینان بخش
حل پیش کر سکتا ہے۔ قرآن اس کا کیا حل پیش کرتا ہے۔ ساری دنیا کی انقلاب آفریں کتاب ہے (چار روپے)

ابلیس و آدم — آدم۔ ملائکہ۔ ابلیس۔ شیطان۔ جنات۔ وحی۔ نبوت کے متعلق قرآنی تصورات (آٹھ روپے)

من و یزداں — خدا کیا ہے۔ انسان کیا ہے۔ ان دونوں کا تعلق کیا ہے۔ تقدیر کسے کہتے ہیں۔ دعا کا مفہوم کیا ہے [illegible] روپے

برقِ طور — حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی آویزش۔ بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی داستان۔ جو اپنی جگہ خود بھی [illegible]
داستان ہے۔ (چھ روپے)

شعلۂ مستور — حضرت عیسیٰؑ کی بصیرت افروز داستانِ حیات۔ کیا آپ بن باپ پیدا ہوئے تھے؟ کیا آپ آسمان پر زندہ ہیں؟ کیا
آپ دوبارہ تشریف لائیں گے؟ (چھ روپے)

سلسبیل — پرویز صاحب کے خطابات اور مقالات کا دلآویز مجموعہ (آٹھ روپے) [illegible]

فجر الاسلام
ضحی الاسلام
مصر کے نامور مؤرخ علامہ احمد امین (مرحوم) کی معرکہ آراء تصانیف کا اردو ترجمہ۔ زمانہ قبل از اسلام سے لیکر
شباب اسلام تک کی تحقیقاتی داستان۔ ان کتابوں نے عالم اسلام میں بڑی شہرت حاصل کی ہے
[illegible]

[illegible] حضرت عثمانؓ کے [illegible]